کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

(افسانے)

مصنف

وہاب اشرفی

ترتیب و تہذیب

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

(افسانے)

HaSnain Sialvi

مصنف
وہاب اشرفی

ترتیب و تہذیب
ڈاکٹر ہمایوں اشرف

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

Kafir Bhi Huye, Sajdah Bhi Kiya

(Short Stories)

By

Wahab Ashrafi

Edited By

Dr. Humayun Ashraf

P. G. Department of Urdu
Vinoba Bhave University
Hazaribagh-825301(Jharkhand)
Mobile : 09771010715
E-mail: dr.h.ashraf@gmail.com

Year of Edition 2011
ISBN 978-81-8223-903-6
Price Rs. 200/-

نام کتاب : کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

مصنف : پروفیسر وہاب اشرفی

ترتیب وتہذیب : ڈاکٹر ہمایوں اشرف

سنِ اشاعت : ۲۰۱۱ء

قیمت : ۲۰۰ روپے

کمپوزنگ : تنویر احمد

مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

ملنے کے پتے

- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
- تاج بک ڈپو، مین روڈ، رانچی
- آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور
- مکتبہ جامعہ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۶
- کتاب دار، ۱۰۸-۱۱۰، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی-۸

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

فکشن کے فنّی رموز و نکات پر
کلی دسترس رکھنے والی ممتاز فنکارہ

جیلانی بانو

کے نام

کلک تو بارک اللہ در ملک و دیں کشادہ
صد چشمہ آب حیواں از قطرۂ سیاہی

HaSnain Sialvi

فہرست

اپنی بات	پروفیسر وہاب اشرفی	7
وہاب اشرفی: ایک گم شدہ ممتاز افسانہ نگار	لطف الرحمٰن	11
کچھ ان کہانیوں کے بارے میں	ہمایوں اشرف	16
کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا		39
چھی چھی، توبہ توبہ		45
گردش میں ہے آسماں		49
کھویا ہوا چہرہ		53
ایک ذرہ، ایک پہاڑ		56
آبگینۂ تندئ صہبا		62
ایک چوٹ، ایک موت		66
...کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے		70
مسیحا کہیں جسے		74
چھوٹی بہو		79
مٹی کا مادھو		85
آخری لاش		90
چراغ پرانا، شمع نئی		93
گرگٹ کے خطوط		101
اپنی اپنی راہ		108
ایک شرط، ایک امتحان		113
پچیسویں قلوپطرہ		118

■ علاج غم دل	121
■ تبسم کی لکیر	126
■ اہرمن اور یزداں	131
■ کوئی غم گسار ہوتا	135
■ ستی ساوتری	139
■ ایک سایہ	143
■ سکنڈ سیکس	147
■ ایک نقش جاوداں	155
■ سنہری زلفیں	158
■ دامنِ مریم	166
■ آئینہ سے شکوہ مت کیجئے	171
■ تھرٹی روپیز — نٹ	174
■ ریتا	178
■ سب خیریت ہے (ڈراما)	181

☆☆

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

اپنی بات

لوگوں کی اچھی خاصی تعداد اس سے واقف ہے کہ میں نے سنجیدہ علم وادب سے رشتہ افسانہ نگاری کے ذریعہ قائم کیا تھا۔ یہ ایک زمانہ پہلے کی بات ہے، تب میں ماہنامہ ''صنم'' پٹنہ کا مدیر تھا۔ ادارت کے علاوہ لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کی ملازمت تھی جسے سرانجام دیتا تھا اور تخلیقی دباؤ کے تحت افسانے لکھتا تھا۔ گویا اس کی ابتدا ۱۹۵۸ء سے ہوئی تھی۔ میرا پہلا افسانہ ''ہاتھی کے دانت'' ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی میں شائع ہوا تھا۔ جب رسالے کی ادارت کا کام سرانجام پا جاتا تو میں تخلیقی کاوش کی طرف مائل ہو جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے تقریباً چالیس پینتالیس افسانے قلم بند کئے ہوں گے جو ہندوستان کے معروف رسائل میں چھپتے رہے تھے اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس وقت اہم فنکار ''بیسویں صدی'' میں بھی لکھتے تھے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اس رسالے نے بہتوں کو عظمت کی راہ دکھائی تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ لیکن ''بیسویں صدی'' کے لکھنے والے صرف اسی رسالے تک محدود نہیں تھے۔ وہ دوسری طرف تاکتے تو ''ادب لطیف''، ''نقوش''، ''سویرا'' اور ''افکار'' تک پہنچتے۔ ''تحریک''، ''کتاب''، ''صبا''، ''نقش'' سے رشتہ قائم کرتے اور کئی دوسرے رسائل ''شاہراہ''، ''اشارہ''، ''راوی''، ''شاعر''، ''شب خون''، ''آجکل''، ''نیا ادب''، ''صبح نو''، ''سہیل''، ''تہذیب''، ''ندیم''، ''سریر''، ''رفتار نو'' وغیرہ سے وابستگی کی سبیل نکالتے۔ میں نے بھی یہی روش اپنائی تھی اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ کبھی بھی میرا کوئی افسانہ کہیں سے واپس نہیں ہوا۔ ہاں ترتیب میں آگے پیچھے کی بات الگ ہے۔ میرا آخری افسانہ ''شب خون'' الٰہ آباد میں شائع ہوا تھا۔ عنوان تھا ''کھویا ہوا چہرہ''۔ میں نے نہ معلوم کس ساعت میں یہ عنوان قائم کیا تھا، تب سے میرا افسانوی چہرہ جو گم ہوا تو اب تک یہی صورت ہے۔ لیکن میں اس سے ادبی طور پر بدحظ نہیں، اس لئے بھی کہ ایک المیے کے

تحت میرا افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا، جس کی تفصیل میری سرگذشت ''قصہ بے سمت زندگی کا'' میں موجود ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ میں اپنی طویل تنقیدی روش کو تیز تر کرتا رہا۔ میں نے جب بھی رسالے نکالے تو ابتدائی صفحات میں مشمولات (مضامین، تخلیقات) کی بابت کچھ نہ کچھ رائے زنی ضرور کرتا رہتا۔ پھر حالات کے تحت باضابطہ مضامین بھی لکھنا ناگزیر ہوتا۔ میں نے تب محسوس کیا تھا کہ افسانہ لویسی فرصت کے وقت کی چیز ہے اور جب ذہن مائل ہو، لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن تنقید کے اپنے مطالبات ہیں۔ اس کا سب سے اہم تقاضا یہ ہوتا ہے کہ نقاد تقابلی مزاج رکھے، تجزیے کے گر سے واقف ہو، نکات کی تلاش کر سکے اور ان کے باب میں واضح رائے دے سکے۔ گویا جہاں فکشن نگار زندگی کو پڑھتا رہتا ہے، نقاد زندگی اور آفاق کے مسائل سے علمی انداز میں الجھنے کی کوشش کرتا ہے، مختلف قسم کے فلسفوں سے دوچار ہوتا ہے، نت نئی تقابلی کتابوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ اپنی کوئی واضح رائے قائم کر سکے اور تقابلی تنقید کی فضا استوار کر سکے۔

چنانچہ نقاد کا مطالعہ ہر حال میں بے حد وسیع ہونا چاہئے۔ اسے اپنے اور دوسری زبانوں کے ادب کی روایات سے آشنا بھی ہونا چاہئے۔ غرض نقاد گہرے مطالعے کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتا اور یہ مطالعہ وسیع کینوس پر ہونا چاہئے جہاں محض اپنی رائے زنی کا سوال ہے وہاں تنقیدی بصیرت کی زیادہ ضرورت نہیں لیکن جب کوئی نقاد تقابلی مرحلے سے گزرتا ہے یا عہد بہ عہد ادبی ارتقاء کا جائزہ لیتا ہے تو پھر اس کی معلومات میں وسعت ناگزیر ہو جاتی ہے۔

ادب اب محض مقامی نہیں رہا۔ زندگی تیز رفتار ہوتی جاتی ہے۔ مختلف میڈیا کے باعث ایک ادب دوسرے سے حیرت انگیز قربت محسوس کرنے لگا ہے۔ نقاد اگر سویا رہے اور محض اپنے روایتی علم یا معلومات کے حدود میں رہے تو وہ لازماً کوئی اہم تنقیدی کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ رائے اسی کی وزنی ہوتی ہے جو صاحب مطالعہ ہوتا ہے اور جس کی ذہن میں تمام چھوٹی بڑی کتابیں کسی نہ کسی نہج پر محفوظ ہوتی ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ تمام کتابوں یا ان کے محتویات کو کسی ایک مضمون میں سمیٹ لے۔ یہ کام کبھی کسی نے نہیں کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ اپنے وقت کے اہم نقاد صاحب بصیرت رہے ہیں جن کا مطالعہ غیر معمولی رہا ہے۔

نئی تنقید نگاری میں تقابلی نوعیت زیادہ سے زیادہ ابھر رہی ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک کتاب ''مغربی و مشرقی شعریات'' قلم بند کی ہے جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ایک زبان یا ایک ملک کی

شعریات دوسرے ممالک یا دوسری زبانوں کی شعریات میں کس حد تک دخیل ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بہت سی ماضی کی باتیں عود کر آتی ہیں اور نئے ادب پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ اس امر کی اگر نقاد کو خبر نہیں ہے تو پھر وہ کوئی اہم ادبی کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ بہر طور یہ عمومی باتیں ہیں جن کا ذکر میں نے ضمناً کیا ہے۔

زیر نظر مجموعے میں میرے ۳۰ افسانے اور ایک ڈراما شامل ہے۔ میں انہیں اگر اپنی پرانی تخلیقات تصور کروں تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔ افسانہ نگاری کا معیار دوسری صنفوں کی طرح ارتقاء پذیر ہے۔ جب میں اس نقطہ نظر سے اپنے افسانوں کو دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ تخلیقات ہیں جنہیں بہت پہلے ایک جگہ جمع ہو کر لوگوں کی نگاہوں میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تنقید قدیم ہو سکتی ہے، تخلیق نہیں۔ کوئی نہ کوئی نکتہ کسی افسانے میں ایسا مل سکتا ہے جو آج بھی تازہ بہ کار سمجھا جائے گا اور اگر نہ بھی سمجھا جائے تو کوئی بات نہیں۔ میرے افسانے میری تخلیقی جہات کا آئینہ ہیں، اسی لئے انہیں لوگوں کے سامنے ہونا چاہئے اور بس۔

اس وقت مجھے ڈاکٹر احمد حسین آزاد یاد آ رہے ہیں جنہوں نے کئی سال پہلے میرے بعض افسانے اِدھر اُدھر سے حاصل کئے اور ایک کتاب اپنے بسیط مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے ''وہاب اشرفی کے افسانے'' کے نام سے شائع کر دی تھی۔ شاید وہ کتاب نہ ہوتی تو بہتوں کے گمان میں بھی نہ ہوتا کہ میں کبھی افسانہ نگار رہا تھا۔ گویا میرے افسانے کے باب میں ان کا بنیادی اور پہلا کام ہے۔ لیکن تب سارے افسانے شریک اشاعت نہیں ہو سکے تھے، ایک آدھ تو نصف افسانہ تھا جو موصوف کی نگاہ میں مکمل تھا۔ وہ بھی شریک اشاعت ہو گیا تھا۔ ایسی ضمنی باتوں کے باوجود اس مجموعے کی اپنی اہمیت ہے اور جب لوگ افسانہ نگاری کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو کسی نہ کسی نہج پر میرا نام لینے سے گریز نہیں کرتے اور کوئی گریز کرتا ہے تو مجھے اس کا افسوس نہیں ہوتا۔ جناب احمد حسین آزاد کی مساعی کا میں کل بھی ممنون تھا اور آج بھی ہوں۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف میرے سلسلے کے کولمبس ہیں۔ مجھے مسلسل تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مجھ پر تقریباً ۹۴۴ صفحے کی کتاب ''وہاب اشرفی: منفرد نقاد اور دانشور'' مرتب کر کے شائع کی۔ اس میں شریک اشاعت سارے مضامین انہوں نے ہی لکھوائے۔ میں نے کبھی اس سلسلے میں کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔ یعنی میں نے فرمائش اپنے طور پر نہیں کی۔ شاید اس لئے بھی کہ میں کام کرنے کے بعد اسے بھولنے کا عادی ہوں۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی میرا معاون موجود رہے کہ

اسے میری نگارشات کی خبر ہوتی رہے۔ خوش قسمتی سے ایسے لوگ ملتے رہے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہے کہ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے میرے لئے وہ جوکھم اٹھایا ہے جو میں خود سات جنم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

اس مجموعۂ افسانہ یعنی ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' میں ایسے افسانے بھی ہیں جن کی تلاش وجستجو میں ہمایوں اشرف کو شب وروز کی محنت کرنی پڑی ہے۔ میں تو انہیں عنوان تک نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر کسی کو ایسے بے غرض محسن مل جائیں تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے اور میں واقعی ہمایوں اشرف کا ممنون ومتشکر ہوں اور اس باب میں خوش قسمت بھی۔

اس مجموعے میں جو افسانے ہیں وہ لوگوں کے ذہن پر کیسا نقش قائم کریں گے، میں نہیں جانتا لیکن بعض افسانوں کی نوعیت ضرور الگ نظر آئے گی۔ میرے دوست اور مشہور افسانہ نگار شفیع جاوید کہتے ہیں کہ مجھے اس مجموعہ کا نام ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' رکھنا چاہئے حالانکہ مجھے ''کھویا ہوا چہرہ'' زیادہ Relevance محسوس ہو رہا تھا۔ میں اپنے دوست کے حکم کی تعمیل میں اس کا نام ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' رکھ رہا ہوں۔ اس باب میں بھی میں ان کا ممنون ہوں۔ کئی دوسرے افسانے ہیں جو پڑھنے والوں کے لئے کوئی بصیرت کا سامان نہ پہنچا سکیں تو حظ کی کیفیت تو پیدا کریں گے ہی۔ ممکن ہے یہ میرا خیال خام ہو۔ میں یہ تحریر بھی ہمایوں کے اصرار پر املا کروا رہا ہوں، ورنہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ موصوف جو لکھیں گے وہی معتبر ہوگا۔ میں اپنے افسانے کے بارے میں کیا رائے دوں، اس کے متعلق تو قارئین کی رائے ہی زیادہ درست ہوگی۔

۷/ مارچ ۲۰۱۱ء

وہاب اشرفی
ہارون کالونی، سیکٹر-۱۱
پھلواری شریف (پٹنہ)

☆☆

HaSnain Sialvi

وہاب اشرفی: ایک گم شدہ ممتاز افسانہ نگار

وہاب اشرفی صدر نشین محفل نقد وادب ہیں۔ مملکت فکر وفن میں ان کا نام سکہ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی جمالیاتی شخصیت ہشت پہلو ہے۔ وہ معتبر محقق ہیں، مستند مورخ ادب، ممتاز نقاد، فلسفہ جمالیات بر حکم، منفرد افسانہ نگار، دلگداز شاعر، تاریخ ساز صحافی، مذہبیات پر الہامی رسائی کی ایک روشن آیت۔ ان کی کتابوں میں ''تاریخ ادبیات عالم''، ''مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب''، ''تاریخ ادب اردو''، ''معنی کی تلاش''، ''آگہی کا منظر نامہ''، ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ''، ''معنی سے مصافحہ''، ''تفہیم فکر و معنی''، ''مغربی و مشرقی شعریات'' وغیرہ ایسی نادر عصر کتابیں ہیں جن کے حوالوں کے بغیر کوئی تحقیقی اور تنقیدی مضمون معتبر نہیں ہو سکتا۔ جن کے مطالعے کے بغیر ادب کے قاری کا دامن شعور ہمیشہ خالی ہی رہے گا۔ جریدۂ ادب و نقد پر ان کی دوامیت ثبت ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود ان کے اندیشہ فکر وفن کے کئی گوشے حیات و کائنات کی آفاقی اور لازوال قدروں کی وجدانی نیرنگی اظہار کے باوجود محتاج اشاعت ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری، ان کی حساس شاعرانہ ربودگی و فتادگی اور مذہبیات پر ان کی وجدانی جگمگاہٹ سے ان کے قارئین محروم ہیں۔

وہاب اشرفی کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ وہ بنیادی طور پر ایک تخلیقی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے کم و بیش چالیس افسانے لکھے جو ملک و بیرون ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ لیکن فی الوقت تلاش بسیار کے باوجود ان کی ۳۰ سے زیادہ کہانیاں دستیاب نہ ہو سکیں جو اس مجموعے کی زینت ہیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے نہایت جد و جہد، محنت، لگن اور تلاش و جستجو کے بعد وہاب اشرفی کی کہانیوں کو یکجا کیا اور ایک بھرپور مقدمہ بھی لکھا، اس کے لئے موصوف یقیناً لائقِ مبارکباد ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ

ہوتا ہے کہ اردو افسانہ نگاری کی صد سالہ روایت اشرفی صاحب کے تخلیقی آیات وافہام کی بنیاد ہے۔ ایک عالم کی حیثیت سے وہاب اشرفی گذشتہ تقریباً چار ہزار برسوں کی جمالیاتی، فکری، شعوری، تخلیقی، روحانی اور اخلاقی ومعاشرتی اقدار وروایات کی معتبر آگہی رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا شعور واحساس اور فکر وفن ہزاروں ہزار برس کے مستقبل کے ایقان ومعنویت کا امین ہے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں انسانی قدروں کا جدلیاتی وقار واحترام موجزن ہے۔ جس کا جمالیاتی اظہار ان کی کہانیوں میں اعتدال اور سلیقے کے ساتھ ہوا ہے۔

میں نے ان کی کہانیوں کے دشت ودیار میں مختلف مقامات ومناظر کا نظارہ ایک زائر کی حیثیت سے کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دانش نورانی اور دانش برہانی کا حسین امتزاج ہے ان کی شخصیت۔

ان کی کہانیوں میں ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا''، ''چھی چھی، توبہ توبہ''، ''گردش میں ہے آسماں''، ''مسیحا کہیں جسے''، ''چھوٹی بہو''، ''مٹی کا مادھو''، ''آخری لاش''، ''پچیسویں قلوپطرہ''، ''کوئی غم گسار ہوتا''، ''گرگٹ کے خطوط'' اور ''کھویا ہوا چہرہ'' ایسی کہانیاں ہیں جو قارئین کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے آباد ہوجاتی ہیں۔

نئے نئے تنقیدی نظریات نے کئی موضوعات کو مرکزی حیثیت دے دی ہے جن میں نسائی یا تانیثی موضوع کے علاوہ پسماندہ طبقوں بہ الفاظ دگر سب الٹرن کے مسئلے کو بحث وتمحیص کا اہم موضوع بنادیا ہے۔ وہاب اشرفی نے ان موضوعات پر اس وقت تخلیقی انفرادیت کا اظہار کیا جب یہ اصطلاحیں پردۂ خفا میں تھیں۔ مثال کے طور پر ان کی کہانی ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' سب الٹرن کے مسئلے پر ایک اچھوتی تخلیق ہے۔

اس کہانی میں ایک زمیندار ہیں۔ دوسرا کردار گاؤں کا ایک پاسی لڑکا ہے، گنیش۔ جس کو اونچے طبقے کے لوگ گنیشوا کہہ کر پکارتے ہیں۔ گنیش حصول تعلیم کی طرف متوجہ ہے۔ زمیندار صاحب کو یہ بات بہت کھٹکتی ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ گنیش حصول تعلیم کے بعد ایک معزز عہدے پر فائز ہوجاتا ہے جس کی خبر زمیندار صاحب کو نہیں ہے۔ اِدھر زمیندار صاحب کو بیٹی کی شادی کرنی ہے جس کے لئے خاطر خواہ رقم کی ضرورت ہے۔ وہ اپنا زمینداری بونڈ لے کر شہر پہنچتے ہیں جہاں لوگوں کے مشورے سے اس شعبے کے صاحب سے ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ وہاں گنیشوا کرسی پر براجمان ہے۔ وہ زمیندار صاحب کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اور ان کی پریشانیوں

سے نجات کا سبب بن جاتا ہے۔ تب زمیندار صاحب کا مصنوعی احساس برتری حقیقت پسندی میں بدلتا ہے۔ وہاب صاحب نے یہ کہانی اس وقت تخلیق کی تھی جب سب الٹرن کو ادبی دائرے میں موضوع بحث نہیں بنایا گیا تھا۔ یہی ہے وہاب صاحب کی تخلیقی ذہانت جو زندگی کے مختلف آفاق وحیات کا مشاہدہ زیرکی کے ساتھ کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔ ''کوئی غم گسار ہوتا'' بھی اسی قبیل کی ایک کہانی ہے جس میں ایک مفلس اور پسماندہ طبقے کے استیصال و استحصال کو درد مندانہ خلش کے ساتھ سفاک حقیقت پسندی سے ہم آہنگ کر کے کہانوی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے۔

''پچیسویں قلوپطرہ'' میں ایک جنسی جنونی کی نفسیات کو افسانے کی شکل دی گئی ہے۔ سہیل کی شادی انگبیں سے ہوئی ہے۔ وہ شادی کے فوراً بعد ہی مزید تعلیم کے لئے آکسفورڈ چلا جاتا ہے جہاں سے اپنی بیوی کو محبت بھرے خط لکھتا ہے۔ وفاداری اور اپنی عفت کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ مگر معاملہ برعکس ہے۔ وہاں کے آزادانہ ماحول میں وہ کھل کھیلتا ہے۔ گھر آتا ہے تو اس کی ڈائری اتفاقاً انگبیں کے ہاتھ لگ جاتی ہے جس میں اس کی عیش کوشیوں کی داستان ہے جس کا ایک جملہ انگبیں کی باطنی شخصیت کی شکست وریخت کے لئے کافی ہے:

''انگبیں سے پہلے صرف چار ہندوستانی لیلاؤں سے اس کا واسطہ رہا۔ آکسفورڈ میں بیس قلوپطرائیں ملیں۔ معیار حسن اور سپردگی کے اعتبار سے انگبیں کا پچیسواں نمبر ہے''۔

کہانی کا یہ نقطہ عروج انگبیں کی داخلی خانہ بربادی کے لئے کافی ہے جسے قاری محسوس کر لیتا ہے۔ جنس سونامی کی طرح ایک طاقتور اور منہ زور طوفان ہے جو اشرافیہ اور ارذیلیہ کی مصنوعی تفریق سے بلند ہے۔ ''چھی چھی، توبہ توبہ'' میں بھی اسی انسانی جبلت کو موضوع فن کی حیثیت دی گئی ہے۔ فن کار اپنی تخلیقی فطرت میں بے حد منصف، ایماندار اور غیر متعصب ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو کسی قلم کار کو ابدیت کا مستحق بناتی ہیں۔ اشرافیہ طبقے کی ایک ضعیفہ نے اپنی ملازمہ کو اپنی تربیت کے سائے میں پوس پال کر جوان کیا تھا۔ وہ ایک دن کسی نوجوان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ خاتون کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ان کی ایک جوان رشتہ دار شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد بیوہ ہوگئی تھی۔ وہ عفت وعصمت کا نمونہ تھی۔ معلّمہ کی حیثیت میں زندگی گزار رہی تھی۔ خاتون کو فخر تھا کہ ان کا خون اپنی خاندانی شرافت اور عزت وآبرو کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ لیکن اتفاق سے ایک رات خاتون کو اپنی معلّمہ کے کمرے میں کچھ عجیب وغریب آہٹ محسوس ہوئی۔ رات بھیگ چکی تھی۔ انہوں نے دریچے سے اس کے کمرے میں جھانکا تو بس اتنا ہی ردعمل ہوا— چھی چھی، توبہ

توبہ۔ یہ کہانی سب الٹرن اور جنس کی اندھی قوت دونوں کے امتزاج پر خوبصورت جمالیاتی تخلیق ہے۔

میں وہاب اشرفی صاحب کی ایک کہانی ''گردش میں ہے آسماں'' کا خصوصی طور پر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میکانکی تمدن کے تخلیقی زوال کی کہانی ہے۔ نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کرتے ہوئے اس حقیقت کی نشاندہی کی تھی کہ فرد اجتماع میں گم ہوتا جارہا ہے۔ نتیجتاً ایک غلامانہ ذہنیت کے تحت جینے پر مجبور ہے۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ بورژوا ژی سماج میں لاشخصی سطح پر بہ جبر جینے والوں کا تجربہ کر کے یہ بتایا کہ موجودہ معاشرے میں فرد یا تو بے تعلق ہے یا لاتعلق ہے۔ فرائڈ نے نطشے اور مارکس کے مشاہدات کی روشنی میں اجتماعی نیوروسس کی تشخیص کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ داخلی شکست وریخت کا یہ سلسلہ اگر جاری رہا تو سماج میں صرف بیمار، مجہول اور نامرد پیدا ہوں گے۔ ایلیٹ کے Hollow Man کی طرح Paralysed Force-Gesture without Motion ''گردش میں ہے آسماں'' ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ گرچہ بعض نقادوں نے اس کو فنطاسی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ کہانی سائنسیت (Sciencticism) یا سائنس کی انتہاپسندی کے فطری نتیجے پر مبنی ہے۔ افسانہ نگار کے زبردست تخلیقی تخیل نے آج سے ہزاروں برس کے بعد مستقبل میں مریخ کے باشندوں کی حیرت زائی کی بنیاد پر یہ کہانی تخلیق کی ہے۔ مریخ کے باشندے سائنسی فتوحات کی بدولت آج کے انسانوں سے قرنوں آگے ہیں۔ وہ سراپا دماغ ہیں۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہ للّی پوشین سے بھی کم ہیں۔ وہ چشم زدن میں ہزاروں برس کی دوریاں طے کر سکتے ہیں۔ مہینے میں ایک کیپسول ان کی غذائی ضرورت کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ لیکن وہ قوت مردی سے محروم ہیں۔ وہ عملاً نامرد ہیں۔ لیکن جب تحقیقی دانشوری کے ذریعے ان کو پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب آدمی پانچ فٹ سے زیادہ کی قامت رکھتا تھا اور بیک وقت کئی عورتوں سے جنسی رابطہ — وہ جنسی توانائی اور فعالیت میں بے مثال تھا جب کہ مریخ کی عورتیں جنسی تسکین کے لئے کئی مردوں سے باضابطہ کنٹریکٹ کرتی تھیں، پھر بھی تشنگی اور ادھورے پن سے انہیں نجات نہیں ملتی تو وہ حیرت میں ڈوب جاتی ہیں۔ سائنسی انتہاپسندی کے پس منظر میں پہلی بار ایک ایسی کہانی وجود میں آئی جو موضوع، تکنیک اور بیانیہ کی سطح پر خوشگوار جمالیاتی ہم آہنگی کا امتزاج ہے۔ یہ کہانی اردو افسانہ نگاری میں بہ ہر جہت اوّلیت کی مثال ہے اور تخلیقی معجزے کا ایک حسین شاہکار بھی۔

وہاب اشرفی کا کمال فن یہ ہے کہ وہ اس وسیع وعریض کائنات میں اپنی کہانیوں کے لئے

ایک عالم اصغر کی تخلیق کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے شہر ہوں کہ گاؤں، سڑکیں، نالے، گلی کوچے، محلے، کردار، واقعات سب کے سب ان کی اپنی سرشٹی کے حامل ہیں۔ جو وہاب اشرفی کی تخیلی پرواز، جدلیاتی ادراک اور تخلیقی تخئیل کی سحر کاری کا نتیجہ ہے۔ انہیں خصوصیات نے ان کی کہانیوں کو جمالیاتی اعجاز کی سرحدوں پر منور آفاق و جہات کا استعارہ بنا دیا ہے۔ فنی ریاضت، جمالیاتی محویت اور تخلیقی استغراق نے ان کی بیشتر کہانیوں کو وجدانی الہام کی آیتوں کا لازوال حسن بخش دیا ہے۔ افسانہ نگاری سے رشتہ سمیٹ کر انہوں نے شاید نہ اپنے ساتھ انصاف کیا اور نہ افسانہ نگاری کی روایت کے ساتھ۔ ان کی شخصیت ایک گم شدہ تخلیقی فنکار کا شاید ایک اہم المیہ ہے۔

پروفیسر لطف الرحمٰن
سابق صدر شعبۂ اردو
تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور (بہار)

☆☆

کچھ ان کہانیوں کے بارے میں

یوں تو پروفیسر وہاب اشرفی اب بحیثیت نقاد اتنے معروف ہیں کہ ان کی دوسری ادبی حیثیتیں تقریباً گم ہوگئی ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے نہ صرف شاعری سے دلچسپی لی بلکہ ایک اچھا خاصا سرمایۂ کلام اب بھی محفوظ ہے جو ان کی ادبی عظمت کو یقیناً ترفع بخش سکتا ہے۔ ان کی غزلیں ایک خاص رنگ کی ہیں، جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے لیکن مجھے اجازت نہیں دی جاتی کہ میں ان کی اشاعت سے گزروں یا ان پر کوئی مضمون قلمبند کروں۔ مصلحت کیا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ جب بھی میں نے اس سے متعلق کچھ سوالات کئے تو وہ بس ٹال گئے۔ دوسری شق وہ ہے جسے میں یا لوگ ان کی افسانہ نگاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری کا سفر بہت طویل نہیں۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک وہ ایک سرگرم افسانہ نگار رہے، اس کے بعد افسانہ نگاری سے دست کش ہوکر تحقیق وتنقید کی جانب مائل ہوگئے۔ ان کا پہلا افسانہ ''ہاتھی کے دانت'' ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی کے ۱۹۵۸ء کے شمارہ میں اور آخری افسانہ ''کھویا ہوا چہرہ'' رسالہ ''شب خون'' الٰہ آباد میں اگست ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کا کوئی بھی افسانہ نگاہوں سے نہیں گزرا۔ گویا وقت اور حالات کی دھند میں اردو کا ایک ابھرتا ہوا افسانہ نگار گم ہوگیا۔ اس لحاظ سے اس مجموعے کا نام ''کھویا ہوا چہرہ'' بہت مناسب لگا۔ لیکن اشرفی صاحب نے اپنے بہت قریب اور مقدم دوست شفیع جاوید صاحب کے مشورے کو قبول کیا۔ لہٰذا مجھے کہا گیا کہ بہتر ہوتا کہ میں 'کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' نام رکھتا، سو یہی کر رہا ہوں۔ وہاب اشرفی صاحب بتاتے ہیں کہ ان کے کل ۴۲ افسانے شائع ہوئے لیکن کب اور کہاں، یہ انہیں قطعی یاد نہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر احمد حسین آزاد نے ان کے کل ۱۱۸ افسانوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''ڈاکٹر وہاب اشرفی کے افسانے'' کے نام سے شائع کرایا تھا۔ اس انتخاب میں ان کے بعض بہت اچھے افسانے شامل

نہیں ہو سکے پھر بھی یہ ڈاکٹر احمد حسین آزاد کا ایک قابل قدر کارنامہ تھا۔ میں تلاش بسیار کے بعد وہاب اشرفی کے ۳۰ افسانے اور ایک ڈراما کو اس خوبصورت مجموعے میں پیش کر رہا ہوں، وہ بھی ان کی اشاعت کی تفصیلات کے ساتھ۔ وہاب صاحب نے افسانہ نگاری کیوں ترک کر دی یہ حیرت کی بات ہے کیونکہ ان کے افسانے پسند کئے جا رہے تھے اور افسانہ نگار کی حیثیت سے معاصرین میں ان کی شناخت تھی۔ ''مٹی کا مادھو''، ''چھی چھی، توبہ توبہ''، ''چھوٹی بہو''، ''آخری لاش''، ''اپنی اپنی راہ''، ''مسیحا کہیں جسے''، ''کوئی غمگسار ہوتا''، ''تبسم کی لکیر''، ''کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے'' جیسی کہانیاں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ کچھ ہندوستان میں اور کچھ پاکستان میں۔ اس مجموعے میں ان کی ابتدائی دور سے لے کر آخری دور تک کی کہانیاں شامل ہیں اور کئی کہانیاں ایسی ہیں جو بالاتفاق بہترین تسلیم کی جا چکی ہیں۔ ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا''، ''کوئی غم گسار ہوتا''، ''گرگٹ کے خطوط''، ''گردش میں ہے آسماں''، ''اہرمن اور یزداں''، ''آبگینۂ تندئ صہبا''، ''اپنی اپنی راہ'' وغیرہ تو ''آجکل''، ''شاعر''، ''راوی''، ''صبح نو''، ''اشارہ''، ''شب خون'' جیسے موقر رسائل میں شائع ہوئے تھے اور جگہ جگہ نقل بھی کئے گئے تھے۔

پروفیسر وہاب اشرفی ایک حاذق طبیب اور بڑے حساس انسان ہیں۔ انسانی نفسیات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ انہیں وقت اور سماج کی نباضی خوب آتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مسائل کو بہت سوچ سمجھ کر فن کا جامہ پہناتے ہیں۔ ان کے یہاں فن اور زندگی کا امتزاج ان کی طرز نگارش سے بے حد حسین ہو جاتا ہے۔ ''گردش میں ہے آسماں'' اور ''کھویا ہوا چہرہ'' میں تو وہ بالکل جدید افسانہ نگار معلوم ہوتے ہیں حالانکہ ان کا تعلق جدیدیت سے قبل کے لکھنے والوں سے ہے۔ اس کا سبب صرف یہی ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے ادلتے بدلتے حالات و واقعات کو شدت سے محسوس کیا اور ان تمام صحت مند قدروں کو اپنی کہانیوں میں سمیٹ لیا جن سے کوئی بھی باشعور فنکار چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ وہاب اشرفی کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

میں شاید غلطی نہیں کر رہا ہوں اگر یہ کہتا ہوں کہ ان کے مطبوعہ افسانوں میں بعض ایسے ہیں جو فنی اور فکری اعتبار سے کسی بھی معیاری افسانے کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کی افسانوی فکر دو سطحوں پر کام کرتی ہے، ایک سطح تو وہ ہے جسے ہم عام زبان میں رومانی یا عشقیہ کہتے ہیں۔ انہوں نے ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں عشق و محبت کے کیف و کم تو ہیں ہی لیکن ایسے افسانوں میں بھی فکر کی کوئی نہ کوئی گہری لکیر ملتی ہے جو معنوی سطح کو خاصی ارفع

بنا دیتی ہے۔ یعنی عشقیہ یا محبت کے افسانے محض تفنن طبع کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ اس حد تک کہ ایسے افسانوں کے اختتام میں گہری فکر اتنی تند ہو جاتی ہے کہ قاری اپنے طور پر کچھ فکری احساسات سے دو چار ہوتا ہے اور غور و خوص کی ایک دنیا بسانے کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ چند افسانے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق عشق و عاشقی سے قطعی نہیں ہے بلکہ ان میں زندگی کے وہ ہیجان ہیں جو اکثر نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں لیکن حساس فنکار کو چونکاتے رہتے ہیں۔ ایسے افسانے بھی کئی ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ سرسری طور پر لکھے گئے ہیں بلکہ ان میں نئی سوچ اور فکر کی سارے رموز پنہاں ہیں۔ یہ عمومی بیانات دلائل چاہتے ہیں۔

میں سب سے پہلے ایسے ہی افسانوں کو زیر بحث لانے کی کوشش کرتا ہوں جو عشق و عاشقی یا ان کے لوازمات سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ نئی حسی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ ایسے افسانوں میں، میں سب سے پہلے ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' کے کئی ابعاد کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ افسانہ رسالہ ماہنامہ ''آجکل'' دہلی کے جنوری ۱۹۶۵ء شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کا قصہ دراصل آج کی اصطلاح میں جسے سب الٹرن کہتے ہیں، اس سے متعلق ہے۔ ایڈورڈ سعید نے غالباً سب الٹرن کی توجیہات پہلی بار پیش کی تھی۔ اب یہ اصطلاح اردو میں رائج ہوگئی ہے۔ پسماندہ گروہ کے لئے اس کا استعمال عام ہے۔ حاشیائی طور پر جینے والے اب اسی سطح پر رکھے جاتے ہیں۔

افسانہ ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' اپنے مزاج و منہاج کے اعتبار سے سب الٹرن موضوع پر ہے۔ فنی و فکری دونوں ہی سطحوں پر اس کا اختصاص محسوس کرنے اور تجزیہ کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے بہت پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ جاگیردارانہ نظام میں خصوصاً زمینداروں کے باب میں جو رویہ تھا، اس سے ہم سبھی واقف ہیں۔ اشرافیہ ایک ایسا طبقہ بن کر ابھرا تھا جس کا اتحاد نچلی سطح کے لوگوں سے مساوی طور پر ممکن نہیں تھا۔ رنگ و نسل ہی نہیں بلکہ ذات پات کی کیفیات کے علاوہ درجات کے فرق نے انسانی زندگی میں جو اختلاف پیدا کئے تھے وہ کسی سے روپوش نہیں۔ آزادی سے پہلے ہندوستان میں یہ صورت بہت شدید تھی۔ اشرافیہ طبقہ کسی دوسرے طبقے کو ہمیشہ ایک خاص انداز سے دیکھتا تھا۔ ایں و آں کا افتراق ہر سطح پر نمایاں تھا لیکن حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ آزادی کے بعد صرف ہندوؤں میں ہی نہیں بلکہ مسلمانوں میں بھی ایسے بھید بھاؤ پر ضرب پڑنے لگی اور شعر و ادب میں ایسے احساسات در آنے لگے جو پہلے موضوع

نہیں بن سکتے تھے یا نہیں بنائے جاتے تھے۔ ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' میں ایک ایسے ہی زمیندار کا قصہ بیان کیا گیا ہے جن کی زمینداری اب ختم ہو چکی ہے۔ لیکن تحکمانہ انداز اب بھی باقی ہے۔ لیکن یہ اکڑفوں تب قائم نہیں رہتی جب افلاس سے سابقہ پڑتا ہے۔ قصہ بس اتنا ہے کہ گاؤں کے زمیندار گنیش (گنیشوا) کی تھوڑی سی تعلیم سے عاجز ہیں۔ زمیندار اور ان کے گھر والے کسی لمحہ یہ بھولتے نہیں کہ وہ پاسی ہے۔ اس کے کپڑے لتے اور انداز گفتگو کو سراہتے نہیں بلکہ اس کی سات پشتوں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں حالانکہ انہیں یا ان کے گھر کی عورتوں کو اس کی تعلیم جدید اور حالیہ ملازمت کی خبر نہیں۔ لیکن زمینداری تو کب کی ختم ہوئی اور زمیندار اپنے معاشی بدحالی کا اس حد تک شکار ہیں کہ گھر کی بیٹی کے لئے ضروری رقم نہیں کہ اسے بیاہ سکیں۔ حالانکہ رشتہ سامنے کا ہے۔ تب وہ زمینداری بونڈ کی طرف تاکتے ہیں اور خود شہر کے دفتر کی طرف رخ کرتے ہیں۔ لوگ انہیں ''صاحب'' سے ملنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہیں تو کرسی نشیں اور کوئی نہیں وہی گنیش یا گنیشوا ہے، جو ان کی حد درجہ آؤ بھگت کرتا ہے اور وہ چیک (بونڈ) بنوا کر جلد ہی ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ موصوف زمیندار پر ایک نیا عالم خیال روشن ہوتا ہے۔ جب لڑکی کی رخصتی ہو جاتی ہے تو ان کے پاؤں اسی پاسی کی طرف اٹھ جاتے ہیں اور وہ اس کے گارجین کو گنیش بابو کو دعائیں پہنچانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کی ایسی موثر کہانی اردو میں کم لکھی گئی ہے۔ اس کہانی کی بابت ڈاکٹر احمد حسین آزاد کی رائے صائب ہے کہ:

> ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' ایک غیر معمولی تخلیق ہے۔ ہمارے یہاں ذات پات کا بھید بھاؤ، رنگ و نسل کا امتیاز، چھوٹے بڑے کا افتراق ہمارے لئے روز روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ وہاب اشرفی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بڑی چابکدستی سے ایک سنگدل طبقاتی امتیاز کے حامل کردار کی قلب ماہیئت کر ڈالی ہے''۔

(''وہاب اشرفی کے افسانے''، از احمد حسین آزاد، صفحہ: ۲۷)

اسی زمرے کی ایک اور کہانی ''چھی چھی، توبہ توبہ'' ہے۔ یہاں نیچی ذات اور بڑی ذاتوں کے ذاتی کردار کا معاملہ ہے۔ موضوع خواتین ہیں۔ کہانی کی بوڑھی دادی نے ''کم ذات'' لڑکی کو پالا پوسا تھا جو ان کے گھر خدمات ادا کر رہی تھی۔ جوان ہوتے ہی اس کے تیور عجیب و غریب ہو گئے اور آخرش وہ ایک ملازم کے ساتھ فرار ہو گئی۔ دادی مخمصے میں تھیں کہ ان کی تربیت کا اس پر اس لئے اثر نہیں پڑا کہ وہ اعلیٰ خاندان سے نہیں تھی جب کہ ان کے سامنے ہی ان کے اپنے خون

کی لڑکی عین جوانی میں شادی کے کچھ دنوں بعد ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ اب وہ معلّمی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھی اور اس کے سارے تیور بڑے بوڑھوں جیسے تھے۔ عزت کا پاس تھا۔ عزت آبرو کے کہتے ہیں لمحہ بھر کے لئے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ دادی موازنہ کرتیں تو ملازمہ اور معلّمہ کا فرق صاف ظاہر ہوتا۔ گویا ''خون'' اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ پر ہوا یہ کہ ایک رات دادی کی نیند ٹوٹی تو معلّمہ کے کمرے میں کسی اور ہی کیفیت کا انہیں اندازہ ہوا۔ وہ دریچے سے جھانکنے لگیں تو بس اتنا کہا کہ ''چھی چھی، توبہ توبہ''۔ نوجوان بیوہ گویا ملازمہ سے مختلف نہیں تھی۔

متذکرہ دونوں افسانے پروفیسر وہاب اشرفی کی فکری احساسات پر دال ہیں۔ دونوں کہانیوں کو آج کے ممتاز اور منفرد افسانوں کی مختصر سی کھیپ میں رکھا جا سکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ موصوف نے خود فن افسانہ نگاری سے اپنا رشتہ توڑ کر ایک اچھے خاصے ارتقائی ذہن پر پہرے بٹھا دیئے۔

وہاب اشرفی کی چند ایسی بھی کہانیاں ہیں جو اپنے تیور، انداز اور Content کے اعتبار سے یاد رکھنے کے لائق ہیں۔ میری مراد ''گردش میں ہے آسماں'' اور ''کھویا ہوا چہرہ'' سے ہے۔ یہ دونوں افسانے مزاج و منہاج کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں نئے شعور کا جس طرح احساس ہوتا ہے وہ شاید و بایدان کے معاصرین میں نظر آئے۔

''گردش میں ہے آسماں'' آج کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں سائنس اور ایجادات کا جو زور رہا ہے ان پر فنی نقطہ نظر سے تنقید کی گئی ہے۔ آج کے حالات کو ہزاروں برس بعد ایک دوسری دنیا میں دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ جب لوگ باگ اپنے پاؤں سے نہیں چلتے۔ ہزاروں کیلو میٹر کی دوری چند منٹوں میں طے کی جاتی ہے۔ وہ پورے مہینے میں بس ایک ٹکیہ کھاتے ہیں۔ گویا کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی ہے۔ قد بھی لٹی پوشین سے کم ہو گیا ہے۔ وہ آج کے حالات کو تحقیقی کتابوں کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں تو حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن یہ کیا پانچ ساڑھے پانچ گز کا 'قدیم' آدمی اب ان کے لئے حیرت زا بن جاتا ہے اس لئے کہ وہ عورت یا کئی عورتوں سے رابطہ رکھ سکتا تھا اور جنسی زندگی توانائی سے خالی نہیں تھی۔ اب 'مریخ' کی عورتوں نے ان گنت مردوں سے رابطہ رکھنے کے لئے کنٹریکٹ کر رکھے ہیں لیکن کوئی بھی زیادہ دنوں تک ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ گویا مریخ کی دنیا نامردوں کی دنیا ہے۔ وہاب اشرفی صاحب نے ایسے مواد کو افسانہ بنانے میں جیسے جوکھم اٹھائے ہوں گے، ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اپنے موضوع پر اردو میں تنہا کہانی ہے جو سائنس کی نئی ایجادات پر قدغن لگاتی ہے اور مستقبل میں ان سے جو

صورت واقعہ پیدا ہونے والی ہے، اس کی پیش گوئی کرتی ہے۔ افسوس کہ قاری اس کے محتویات سے آج بھی بے خبر ہے۔ پاکستان کے مشہور فکشن نگار اور ناقد علی حیدر ملک اسے ایک فنطاسی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہاب اشرفی کا قد چھوٹا سہی لیکن ان کا فن قد آور ہے، وہ ایک مجسم فن کار ہیں، انہوں نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں اس دور کا صحیح مزاج اور کردار ملتا ہے، زبان اور انداز بیان پر انہیں قابل رشک حد تک قدرت حاصل ہے۔ ''مسیحا کہیں جسے'' اور ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' موضوع کے لحاظ سے اہم کہانیاں ہیں۔ ''کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے'' اور ''گرگٹ کے خطوط'' مزاحیہ کہانیاں ہیں جن کے اندر ایک گہرا طنز پوشیدہ ہے، ''گردش میں ہے آسماں'' میں اشرفی صاحب کا فن اپنے عروج پر آ گیا ہے۔ یہ ایک ایسی فنطاسی ہے جس کے مقابلے کی صرف چند فنطاسیاں پورے اردو ادب سے پیش کی جا سکتی ہیں، وہاب صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی گھٹیا اور تیسرے درجے کی کہانیاں نہیں لکھیں''۔

(مقالہ ''بہار کے جدید افسانہ نگار — ایک تعارف''، مطبوعہ ''کوئل''، دوماہی، ڈالٹین گنج، جلد-۳، شمارہ-۱۰، ۱۹۶۴ء)

اس اقتباس سے وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری کے کئی پہلوؤں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

''کھویا ہوا چہرہ'' پروفیسر وہاب اشرفی کا آخری افسانہ ہے جو رسالہ ''شب خون''، الہ آباد میں اگست ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یعنی آج سے ۴۳ سال پہلے۔ ڈاکٹر احمد حسین آزاد، ڈاکٹر مناظر حسن اور محمد امجد حیات برق صاحبان نے اپنی تصانیف میں اس کہانی کی سن اشاعت ۱۹۶۵ء لکھا ہے جو کہ بالکل غلط ہے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ یہ وہاب اشرفی صاحب کا آخری افسانہ ہے۔ اس کے بعد موصوف نے کوئی افسانہ نہیں لکھا، ایسا فیصلہ انہوں نے کیوں کیا مجھے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ ڈاکٹر مناظر حسن نے اپنے تحقیقی مقالہ ''وہاب اشرفی: شخصیت اور فن'' میں اس سوال کا جواب قیاس کرتے ہوئے یوں دیا ہے:

''احمد حسین آزاد نے اپنے مقدمے ''ڈاکٹر وہاب اشرفی کے افسانے'' میں ایک سوال ابتدا ہی میں اٹھایا ہے، یعنی انہوں نے افسانہ نگاری کی راہ یکسر کیوں ترک کر دی، میں نے بھی یہ سوال بالکل شروع میں ہی سامنے لایا تھا، اب وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری

سے متعلق اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مجھے دو باتیں کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہاب صاحب نے افسانوں کی طرف توجہ شاید اس لئے کی تھی کہ وہ غزل گوئی کی دنیا میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکتے تھے، موجودہ صدی کی پانچویں دہائی میں تقسیم ملک کے صدمے اور فرقہ وارانہ فسادات کی مار سے نڈھال قوم کا مزاج شعر گوئی اور افسانہ نویسی کی طرف مائل ہونا ہی تھا۔ ملک میں ایک سے ایک غزل گو شاعر موجود تھے اور افسانہ نگاری کی روایت بھی کافی آگے بڑھ چکی تھی، ایسی صورت میں کسی نوجوان قلم کار کا ان دونوں میں سے کسی ایک یا دونوں ہی اصناف ادب کی طرف متوجہ ہو جانا فطری امر تھا۔ یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہاب اشرفی نے شاعری کی طرف کیوں توجہ نہیں کی، اس کے جواب میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ وہاب اشرفی نے بلاشبہ شعر بھی کہے، پہلے کا تو مجھے علم نہیں، مگر پچھلے چند برسوں کے دوران کہی گئی ان کی کئی غزلیں مجھے سننے کا اتفاق ہوا، کبھی خود ان کی زبان سے اور کبھی ان کے عزیزوں یا دوستوں کی زبان سے۔ بہر حال اس زمانے میں بھی اگر انہوں نے شعر کہے ہوں گے تو لازمی طور پر مشاعروں میں شرکت اور مقبولیت کی تمنا کی ہوگی اور یہ شئے صرف شعر گوئی یا اچھی غزل گوئی سے ہاتھ نہیں آتی، کم از کم اس عہد میں تو شکست خوردہ ذہنیتیں ترنم کو بھی شاعری کا ایک جزو سمجھتی تھیں اور یہ وہاب اشرفی کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے انہوں نے شاعری کی طرف توجہ نہیں کی ہوگی اور افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس میدان میں بھی انہوں نے حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا، لیکن ۱۹۶۰ء تک آتے آتے اردو افسانہ جس طرح نئے پیرہن بدلنے لگا، اس نے وہاب اشرفی کو بھی متاثر کیا، ان کا آخری افسانہ ''کھویا ہوا چہرہ'' ۱۹۶۵ء میں ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد میں شائع ہوا، اس وقت تک 'جدیدیت' ایک فیشن کے طور پر اختیار کی جانے لگی تھی اور افسانہ لکھنے والوں سے گویا یہ مطالبہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک خاص فارمولے کے تحت افسانہ لکھیں، وہاب اشرفی کے اس آخری افسانے پر جدیدیت کے اثرات نمایاں ہیں، اس کے بعد انہوں نے افسانہ نگاری ترک کر دی، کیونکہ وہ فیشن کے تحت کوئی افسانہ لکھنے کے حق میں نہیں تھے اور جدیدیت کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ جوڑنا مناسب نہیں تصور کرتے تھے''۔

(''وہاب اشرفی: شخصیت اور فن''، ڈاکٹر مناظر حسن، ص: ۴۷-۴۸)

میں اسے ان کے کیریئر کا المیہ سمجھتا ہوں۔ بہر طور ''کھویا ہوا چہرہ'' بھی اپنی نوعیت کی ایک الگ تخلیق ہے۔ افسانہ نگار اپنی ذات کو Asses کر رہا ہے اور پروفروک (ٹی ایس ایلیٹ کی نظم کا کردار) سے بھی اپنے کو کم تصور کرتا ہے۔ اسے چائے کی چمچی کے برابر بھی اپنی اہمیت سے انکار ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی نظم ''پروفروک'' کی عقبی زمین میں یہ کہانی کھڑی ہے اور افسانہ نگار کی فکری سطح کو واضح کر رہی ہے۔ فنی اور فکری اعتبار سے بھی اس کی نوعیت بہت مختلف ہے۔ افسانہ اس لائق ہے کہ تجزیے کے مرحلے سے گذرے اور معنوی امکانات مزید روشن ہوں۔

''ایک ذرہ، ایک پہاڑ'' دراصل اپنے موضوع کے اعتبار سے انسانی دل سوزی، دوسروں کے لئے جینے کے عمل، وطن کے لئے قربانی، ذاتی مفاد سے بیگانگی وغیرہ کی مثالیت (Idealism) پر مبنی ہے اور خوب ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں جو درس پنہاں ہے وہ زندگی جینے کی نئی تعبیرات پیش کرتا ہے۔ ٹریٹمنٹ میں کہیں بھی غلو کا احساس نہیں ہوتا اور کم لفظوں میں معیاری طرز زندگی کے خصائص سامنے آجاتے ہیں۔ یہاں فکر و فن کا ادغام دیدنی ہے اور اشرفی کی فنی گرفت پر دال ہے۔

''آبگینۂ تندیٔ صہبا'' تو بظاہر رومانی کہانی ہے لیکن اس میں ایک خاتون کی ذہنی نزاکت اور نفاست کو افسانہ بنایا گیا ہے۔ یہ ایک ٹریجڈی ہے جو ہنستے کھیلتے سامنے آجاتی ہے۔ مرد و زن کے مزاج اور میلان کی خبر دینے والی یہ کہانی بہت سے احساسات جگاتی ہے۔ خصوصاً کسی ذی ہوش اور قوی حسیات رکھنے والی عورت کا انجام بس وہی ہونا تھا جو اس کہانی میں ہوا ہے۔ کہانی کا قوام ایسا ہے کہ آخر کی سطریں نیا عالم خیال روشن کر دیتی ہیں اور حساس قاری کو دل گرفتہ بنا سکتی ہیں۔ اس کہانی کے بارے میں ڈاکٹر احمد حسین آزاد کی رائے ٹھیک ہی ہے کہ:

> ''افسانے کی ہیروئن حد درجہ حساس ہے اور لمحہ لمحہ اپنی حسیات کے دائرے میں گذارتی رہتی ہے لیکن محض ایک واقعہ اس کی زندگی میں تلخیاں بھر دیتا ہے، وہ مذاق بھی بہت معمولی سا ہے لیکن وہ اس مذاق کی تاب نہیں لا سکتی اور اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتی ہے''۔

(''وہاب اشرفی کے افسانے''، مرتبہ: ڈاکٹر احمد حسین آزاد، ص:۱۹)

''ایک چوٹ، ایک موت'' اپنی نوعیت کی ایک الگ سی کہانی ہے۔ دفتر کا ایک کلرک اپنے افسر ٹوم کے تیور اور اس کی انانیت اور غرور سے عاجز ہے۔ یہاں تک کہ وہ مستعفی ہو جاتا ہے۔ کسی اور کام سے لگنے کے سبب اسے کچھ پیسے حاصل ہو جاتے ہیں تب وہ اپنے سابقہ مغرور

آفیسر کو اپنے گھر دعوت پر بلاتا ہے، خاطر مدارات سے گذرتا ہے، اس کی افسری کے قصیدے پڑھتا ہے، رخصت کے وقت وہ اپنے سابقہ آفیسر کو اپنے کتے سے ملاتا ہے۔ بتاتا ہے کہ اس نے اس کا نام ''ٹوم'' رکھا ہے۔ تب افسر کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ لمحہ اس کے لئے موت سے کم نہیں تھا۔ عجیب افسانہ ہے۔ انداز بھی خوب ہے۔ اختتام کا مرحلہ کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہاب اشرفی بنیادی طور پر ایک مفکر ہیں لہٰذا ان کے افسانوں میں چاہے وہ غایت رومانی ہوں لذت کوشی کے لئے نہیں ہیں۔ زندگی کی تلخیاں ایک عجیب انداز سے ان کے یہاں پیش ہوتی ہیں۔ اس طرح کہ پلاٹ بوجھل نہیں ہوتا اور افسانہ نگار کا موقف واضح ہو جاتا ہے۔ میں اس فکری میلان کی دلیل کے طور پر ان کی کہانی ''کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے'' پر چند جملے لکھنا چاہتا ہوں۔ اردو میں میری معلومات کی حد تک اس قبیل کی کوئی دوسری کہانی نہیں۔ یہاں جھوٹ والا کردار دراصل Personified یعنی مشخص غلو ہے، بلکہ اغراق ہے۔ کردار کا قرب ذاکر حسین، پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی تک ہوتا تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن آخری ہچکیوں کے درمیان لارڈ براؤن تک معاملہ پہنچتا ہے تب ''افتخار نانا'' کی روح قفس عنصری سے پرواز کرتی ہے۔ پوری کہانی افتخار نانا کے گرد گھومتی ہے۔ یہ ایک ایسا بڑبولا کردار ہے جو جھوٹ بولنے میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ کہانی کار نے اس کا نفسیاتی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ افتخار نانا سو فیصد جھوٹ بولتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کہانی کا عنوان ''کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے'' رکھا گیا ہے۔ ایسا کیوں؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر احمد حسین آزاد رقمطراز ہیں:

> ''دراصل یہ عنوان Ironical ہے۔ جس شخصیت کی تعمیر کی گئی ہے، وہ جھوٹ بولنے میں ایسا طاق ہے کہ اس کی مثال ملنی محال ہے..... چنانچہ ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ اس شخص سے اس کی اس علت کے باعث نفرت نہیں ہوتی بلکہ اس سے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے۔ دراصل مرکزی کردار نفسیاتی مریض ہے اور جھوٹ بول کر کسی کو ضرر پہنچانا نہیں چاہتا بلکہ شدید احساس کمتری کی کتھارسس کرتا ہے''۔

(''وہاب اشرفی کے افسانے''، مرتبہ: ڈاکٹر احمد حسین آزاد، ص: ۱۸)

''مسیحا کہیں جسے''، جنسی رجحان پر مبنی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ کہانی تین نظریوں کے تصادم سے آگے بڑھتی ہے۔ ایک نظریہ تو مارکسی ہے، دوسرا امریکی اور تیسرا مذہبی۔ ایک ٹورسٹ ہوٹل میں تینوں نظریے کے علمبردار اپنے اپنے نظریے کی صداقت کے اظہار میں اتنے پرجوش اور

اٹل ہیں کہ ایک دوسرے کی بات کو ماننے کے لئے قطعی تیار نہیں، بلکہ اپنے موقف پر سختی سے قائم ہیں۔ ان کے بحث ومباحثے میں شدت آتی جاتی ہے اور یہ لفظی جنگ قتل وغارت گری کے مرحلے میں داخل ہی ہونے والی ہوتی ہے کہ ہوٹل میں ایک رقاصہ مارتھا کا داخلہ ہوتا ہے۔ اس کی آمد سے ان لوگوں کے تمام فلسفے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور ان کی گفتگو کا موضوع مارتھا کا حسن وجمال بن جاتا ہے۔ کہانی کار نے جس طرح ''چھی چھی، توبہ توبہ'' میں یہ دکھایا ہے کہ جنسی تقاضے کے سامنے ہر انسان بے بس ہے، رنگ ونسل یا عمر کی دیواریں اس مطالبے کے آگے پل میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ ''مسیحا کہیں جسے'' میں بھی کہانی کار نے بہت ہی اعتماد کے ساتھ تمام نظریوں پر جنس کی بالادستی کو ثابت کیا ہے اور اتنے فطری اور ڈرامائی انداز میں کہ پڑھنے والا اس کے موقف کی تائید پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ''چھی چھی، توبہ توبہ'' میں جنسی قوت کے سامنے عورت بے بس ہے اور ''مسیحا کہیں جسے'' میں اس کے آگے مرد سرنگوں۔ اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشد کاکوی نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ:

> ''آپ نے ہمیں ایک اچھا افسانہ دیا ہے۔ عورت وہ موضوع ہے جس پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے لیکن آپ نے ایک عجیب پہلو نکالا ہے۔ افسانہ کی تکنیک بھی بڑی نازک ہے۔ ٹورسٹ ہوٹل کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جوش نے اپنی معرکۃ الآرا نظم ''فتنہ خانقاہ'' میں ایک رہزن تمکین وہوش کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ خانقاہ کے عمامے سنبھالے نہیں سنبھلتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''ہونٹوں پہ دب کے ٹوٹ گئی ضرب لا الٰہ''۔ یہاں کم وبیش یہی فضا ہے۔ کارل مارکس کا فلسفہ، مولانا کا ایمان و قرآن، بنیا کا کھاتا سب دھرا رہ جاتا ہے۔ ہر موضوع پر آپس میں اختلاف رکھنے والی ٹوپی، ٹائی، گنجی، بس ایک موضوع پر متفق ہیں اور وہ موضوع ہے انگیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ اپنی ذہانت میں ریاضت کو بھی شریک کرلیں تو آپ سے زیادہ بلند تر توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں''۔

(''مکتوب ''صنم''، پٹنہ، جون ۱۹۶۰ء)

''چھوٹی بہو'' میں گاؤں کے ایک نیم تعلیم یافتہ بلکہ جاہل گھرانے کی توہم پرستی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پوری کہانی منگلن نانی اور ان کی چھوٹی بہو کے گرد گھومتی ہے۔ منگلن نانی خاصی پریشان ہیں کہ چھوٹے کی شادی کو پانچ سال ہو گئے لیکن بہو کے ابھی تک پاؤں بھاری نہیں

ہوئے۔ لہٰذا وہ بچے کی چاہت میں دعاء، تعویذ، جھاڑ پھونک اور اس قبیل کے تمام حربے استعمال کرتی ہیں۔ بہو کی حالت کچھ ایسی ہو جاتی ہے جس سے ساس کو لگتا ہے کہ وہ امید سے ہے لیکن سچائی یہ تھی کہ اس کے پیٹ میں بچہ نہیں بلکہ کوئی خطرناک مرض تھا جس کی وہ شکار ہو کر جاں بحق ہو جاتی ہے۔ وہاب اشرفی نے اس کہانی میں دیہات کی ٹوپوگرافی اور عورتوں کے جذبات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ ایک ایسی ساس جو گھر میں پوتا پوتی کی آمد کی منتظر ہو، بہو کو املی کی چٹنی اور مٹی کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی ہے کہ بہو کے پاؤں بھاری ہیں، اب گھر میں کلکاریاں گونجیں گی، لیکن جب صورت اس کے برعکس ہو جاتی اور چھوٹی بہو داغ مفارقت دے جاتی ہے تو:

''اور تب مریم دادی نے منگلن نانی سے کہا،

اب چپ رہ پگلی! جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ یہ دنیا تو آنی جانی ہے۔ مت رو، مرنے والی کا جنازہ بھاری مت کر۔

منگلن نانی نے اتنا کچھ سنا تو اور زور سے رونے لگیں۔ دوسری عورتوں نے بھی اتنے ہی زور سے ان کا ساتھ دیا۔

''ہائے میری اچھی بہو! میرے سر میں اب تیل کون دے گا، میرا پاؤں اب کون دبائے گا''۔

''اب چپ بھی رہ سب کچھ تو تھی پر بانجھ تھی!''

اور منگلن نانی یکا یک خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے آنچل کے کونے سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ لئے''۔

(''چھوٹی بہو''، ص:۸۴)

گویا سماج میں عورتوں کی سب سے بڑی خرابی اس کا بانجھ ہونا ہے۔ کہانی کار نے عورت کی تحلیل نفسی اس ہنرمندی سے کی ہے کہ مریم دادی، منگلن نانی اور دیگر خواتین کا رویہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

''مٹی کا مادھو'' وہاب اشرفی صاحب کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ اس کا موضوع نہایت سیدھا سادہ ہے۔ یعنی شوہر کا نامرد ہونا اور عورت کا محرومی کی صورت میں کسی دوسرے مرد کی جانب راغب ہو جانا۔ لیکن اس کہانی میں صرف اتنا کچھ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک عورت کے تئیں سماج کے رویے اور عورت کی نفسیات کو بھی بڑی چابکدستی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ باندی ایک

نوکرانی ہے جو خوبصورت، طرحدار اور گداز جسم کی بھی مالک ہے۔ اس کے ساتھ عموماً وہی واقعات ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک جوان نوکرانی کے ساتھ روا رکھے جاتے ہیں۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی ریاض صاحب کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں اسے کچھ نئے حالات و تجربات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کو لے کر نہ تو صاحب اور میم صاحبہ میں جھڑپ ہوتی ہے اور نہ ہی اس پر کچھ بندش لگتی ہے۔ گھر کی فضا بھی اسے کچھ عجیب و غریب لگتی ہے:

''بیگم ہر دوسرے روز غسل کرتیں جب کہ ریاض صاحب بغیر غسل کئے دفتر نہیں جاتے اور دفتر جانا روز ہی ہوتا تھا، سوائے اتوار کے، تو اتوار کو ریاض صاحب نہیں نہاتے۔ غسل کا معمول تو یہ تھا لیکن ان کے پلنگ کی چادریں ہفتوں نہیں بدلی جاتیں، یہ بات تعجب کرنے کی ایسی خاص تو نہیں تھی لیکن باندی کے لئے حیرت کی بات یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ ان کے پلنگ کی چادریں ہفتوں تقریباً اسی حالت میں ہوتیں جس حالت میں وہ بچھائی جاتیں، جیسے رات کے وقت ان پر کوئی سو گیا ہو اور پھر اٹھ گیا ہو، نہ اس کے آگے کچھ نہ اس کے پیچھے کچھ''۔ (''مٹی کا مادھو''، ص: ۸۷)

باندی نے اپنے طور پر سمجھا کہ شاید میاں بیوی میں کچھ کشیدگی ہے لیکن حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ دونوں میں کبھی کوئی تکرار بھی نہیں ہوئی۔ باندی کی تجسس روز افزوں بڑھتی ہی جاتی ہے کہ ایک دن ریاض صاحب از راہ مذاق مصنوعی داڑھی ٹھڈی سے لگا کر بیگم کے سامنے وارد ہوئے اور وہ نہ صرف ڈر گئیں بلکہ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی لیکن جب ان پر حقیقت ظاہر ہوئی تو وہ بے ساختہ بول پڑیں:

''توبہ ہے، میں تو سمجھی کوئی مرد ہے''۔

اس جملے نے پہلے تو باندی کو حیرت میں ڈالا لیکن پھر اس پر پوری کیفیت عیاں ہوگئی کہ کیوں بیگم صاحبہ اور ریاض صاحب دور دور رہتے ہیں، کیوں بیگم صاحبہ اسے گھر پر تنہا چھوڑ کر باہر چلی جاتی ہیں، کیوں انہوں نے اس کے بھائی شدو کو فوراً ملازم رکھ لیا تھا اور کیوں ان دنوں انہیں اکثر چکر آتا ہے اور متلی ہوتی ہے۔ کہانی کا اختتام بڑا چونکانے والا ہے۔

کہانی کار نے اس کہانی میں عورت کے جذبات و نفسیات کی حیرت انگیز انداز میں عقدہ کشائی کی ہے، دیکھئے کہ وہ باندی جو ہر جگہ سے نوکری اس لئے چھوڑ دیتی ہے کہ صاحب یا ان کے صاحبزادے بری نظر سے دیکھتے ہیں اور تنگ کرتے ہیں۔ لیکن جب ریاض صاحب اسے نظر بھر

کے دیکھتے بھی نہیں تو باندی ان کی بے رخی اور بے نیازی کی شاکی ہوتی ہے۔ عورت کی نفسیات کا یہ اتار چڑھاؤ واقعی حیرت زا ہے۔

''آخری لاش'' ایک المناک کہانی ہے۔ اس میں ایک غریب گورکن کی کہانی پیش کی گئی ہے جو اپنی جوان بیٹی کی شادی کے لئے جہیز جمع کرنے میں منہمک ہے۔ جہاں اس کی بیٹی کا رشتہ طے ہوا ہے وہاں کے مطالبے کے مطابق اسے ابھی بھی ایک خاص رقم ادا کرنی ہے اور روپے تو قبر کھود کر ہی فراہم ہو سکتے ہیں جو اس کا پیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ نئی قبریں اسی وقت بنیں گی جب لوگ مرتے رہیں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ علاقے میں ہیضہ پھیل جاتا ہے جس کے نتیجے میں گورکن کی آمدنی بڑھ جاتی ہے۔ نئی قبریں کھدتی رہتی ہیں اور بیٹی کا جہیز تیزی سے جمع ہونے لگتا ہے۔ اب ایک اور لاش آجانے سے جہیز کی متعینہ رقم پوری ہو جائیگی۔ وہ سوچتا ہے کہ کاش ایک لاش اور آجائے اور اسے دور سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے کہ اب اس کی بیٹی کی ڈولی سج جائے گی۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آخری لاش جو آتی ہے وہ اس کے ہونے والے داماد کی تھی۔

بعض لوگوں نے اس افسانے میں ڈاکٹر محمد محسن کے افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' سے مماثلت کی بات اٹھائی ہے۔ دونوں کہانی میں مماثلت کا پہلو بس اتنا ہے کہ وہاں بھی دوسروں کی موت کردار کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے اور یہاں بھی۔ لیکن ''انوکھی مسکراہٹ'' ایک نفسیاتی کہانی ہے اور ''آخری لاش'' اصلاحی۔ کہانی کار نے یہاں بین السطور میں انسان کی خودغرضی اور جہیز کی لعنت کو ہدف ملامت بنایا ہے اور اس کمال فنکاری سے ماجرا کی تعمیر کی ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔

''چراغ پرانا، شمع نئی'' کا مرکزی خیال یہ ہے کہ بعض رویے ایسے ہوتے ہیں جو نسل در نسل قائم رہتے ہیں خواہ زمانہ ترقی کی کتنی ہی منزلیں طے کر لے۔ کہانی کار اس میں یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ محبت اور شرم و حیا عورت کی شرست میں داخل ہیں۔ جب تک وہ کنواری رہتی ہے آرزوؤں کے محل سجاتی ہے مگر جب اس کی شادی کی بات چلتی ہے تو وہ فطری طور پر شرما جاتی ہے۔ ہندوستانی عورت کی خاص طور سے یہ فطرت ہوتی ہے کہ شادی کے بعد وہ صرف اپنے شوہر کے ہی سپنے دیکھتی ہے جس سے اس کی محبت ایک خاص دائرے میں سمٹ جاتی ہے۔ کہانی کار نے اس حقیقت کو دو کردار جنت نانی اور نیلوفر کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جب نیلوفر کی شادی کی بات چلتی ہے تو جنت نانی کو اپنی جوانی کے دن یاد آنے لگتے ہیں۔ کہانی کار نے فلیش بیک کے ذریعہ بار

بار جنت نانی کے گذرے ہوئے ایام کو سامنے لایا ہے۔ ڈاکٹر احمد حسین آزاد نے اس کہانی کے سلسلے میں جنریشن گیپ کی بات اٹھائی ہے، دراصل ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ اس کہانی کے بنت میں نہیں اتر پائے ہیں۔ یہ کہانی خالص اصلاحی نوعیت کی ہے۔ افتخار اور صمد نانا کی گفتگو کی طرف رخ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ جہیز کی لعنت ہمارے معاشرے کو کس طرح جکڑ چکی ہے کہ اب لڑکے کھلے عام اس پر فخر کرنے لگے ہیں۔

''گرگٹ کے خطوط'' مکتوب کے فارم میں لکھی گئی وہاب اشرفی کی مشہور کہانی ہے۔ اس کہانی کے متعلق ڈاکٹر احمد حسین آزاد کی رائے درست ہے کہ:

> ''افسانے میں ہائی پوکریسی کے خلاف صف آرائی کی گئی ہے اور وہ بھی فنکاروں کی ہی۔ ایک ادیب جو دوسرے کی رایوں کو قابل لحاظ نہیں مانتا، رایوں کے حصول میں خاصی تگ ودو کرتا ہے اور دوسروں کی رائیں اس کے لئے سند کا کام کرتی ہیں لیکن وہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ واقعتاً بے نیاز ہے۔ اس افسانے کی پوری ہیئت Ironical ہے۔ تضادات کی مسافت کا یہ افسانہ دلوں میں اتر جاتا ہے اور فنکاروں کی ہائی پوکریسی بے نقاب ہو جاتی ہے''۔

(''وہاب اشرفی: شخصیت اور فن''، ڈاکٹر مناظر حسن، ص:۶۱)

عصر حاضر میں یہ رویہ عام ہو گیا ہے کہ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ یعنی کسی شخص کے منہ پر کچھ کہتے ہیں اور اس کی پیٹھ پیچھے کچھ اور۔ ہمارے کردار و عمل کا یہ تضاد ایک عجیب مضحکہ خیز صورت حال اختیار کر رہا ہے جس کی عکاسی وحشی عظیم آبادی کے کردار کے ذریعہ اس کہانی میں بطریق احسن کی گئی ہے۔ ''گرگٹ کے خطوط'' میں وہاب صاحب نے ادیبوں کے حرص و ہوس کا پردہ فاش کیا ہے۔ ایک ادیب وحشی عظیم آبادی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اور زکی انور کو الگ الگ خط لکھتے ہیں۔ وہ جس کو بھی خط لکھتے ہیں اسے ہی سب سے بڑا افسانہ نگار کہتے ہیں لیکن دوسروں کو لکھے گئے خطوط میں اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اس طرح چاپلوسی اور عیاری سے وہ بڑے ادیبوں سے اپنے متعلق اچھی رائے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ادیب اور دانشور جو سچائی کا علمبردار ہوتا ہے، اس کا یہ کردار ہمارے لئے سخت ہیجان کا باعث بنتا ہے۔ کہانی کار نے بڑی صناعی سے غیر متعلقہ افسانہ نگار کے افسانوی نہج اور طریقہ کار کو بھی سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ اس طرح سارے کردار ابھر گئے ہیں۔ وحشی

عظیم آبادی کے لائحہ عمل سے بھی قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہانی کار نے بڑی چابکدستی سے سارے چہروں کو ان کے اصلی خدوخال میں عیاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ نہایت کامیاب ہے۔

''اپنی اپنی راہ'' بھی خطوط کی تکنیک میں لکھی گئی ایک موثر کہانی ہے۔ کہانی کار نے اس میں جدید دور کے طرز فکر کو ایک فلمی رائٹر پریمی کے ذریعہ اس طرح آشکار کیا ہے کہ یہ پہلو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ آج ہر شخص دوسروں کو بیوقوف بنانے پر کمربستہ ہے اور خود کو نہایت چالاک سمجھتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ Selfish یعنی خودغرض ہیں، بس اپنا کام نکال لینا چاہتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے اس کہانی کے بین السطور میں فلمی صحافت پر بھی جابجا طنز کے نشتر لگائے ہیں۔

''ایک شرط، ایک امتحان'' ایک رومانی کہانی ہے۔ اس کا موضوع کوئی خاص نہیں ہے۔ مسٹر ریاض ایک کرسچن لڑکی مس سوزی کی محبت میں اس طرح اسیر ہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن معشوقہ کو ان کا یہ رویہ پسند نہیں آتا اور وہ عین موقع پر شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ مس سوزی ہچکیوں کے درمیان کہتی ہے:

> ''مسٹر ریاض! آئی ایم ویری ساری، آپ میرے لائق نہیں ہیں۔ آپ اگر اپنے مذہب پر قائم رہتے تو میں آپ کو عظیم انسان سمجھتی اور آپ سے شادی کر لیتی۔ آپ جس آسانی سے آج مذہب بدل لینے کو تیار ہیں، ایک دن بیوی بھی بدل لیں گے''۔

(''ایک شرط، ایک امتحان''، ص: ۱۱۷)

گویا جذبۂ عشق انسان کو اپنا مذہب تک بدل لینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ کہانی کار نے اس جذبے کو جس انداز سے کہانی میں پیش کیا ہے اس کے پیش نظر یہاں پر عشق سے زیادہ جنس کا لفظ چسپاں ہوتا ہے۔

''پچیسویں قلوپطرہ'' میں ایک مرد کی رذالت کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ انگبین کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ اس کے شوہر سہیل کو شادی کے فوراً بعد مزید تعلیم کے لئے آکسفورڈ جانا پڑتا ہے۔ وہ آکسفورڈ سے اکثر انگبین کو محبت بھرے خطوط لکھتا رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عذاب میں گذر رہا ہے اور یہ کہ آکسفورڈ یا اس علاقے میں انگبین جیسی کوئی حسینہ نہیں لیکن سچائی تو یہ ہے کہ وہ ہر شب نئی عورت کا متمنی رہا ہے اور اپنی مکاری، عیاری، لفاظی اور معاملہ شناسی

سے عورتوں کو پھنسا کر اپنا الو سیدھا کرتا رہا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ انگبین کے ہاتھ اس کی ذاتی ڈائری آجاتی ہے جس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ:

''انگبین سے پہلے صرف چار ہندوستانی لیلاؤں سے اس کا واسطہ رہا تھا۔ آکسفورڈ میں بیس قلوپطرائیں ملیں، معیار حسن اور سپردگی کے اعتبار سے انگی کا پچیسواں نمبر ہے''۔

اپنے اوپر جان چھڑکنے والے شوہر کا یہ تحریری بیان پڑھ کر انگبین کس جان لیوا مرحلے سے گذری ہوگی۔ اس فکر کے ساتھ ہی افسانہ ختم ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے کو حیرت و استعجاب کی ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار کر جاتا ہے۔ یہ غیر متوقع انجام ہی کہانی کار کی ذہانت کا عمدہ ثبوت ہے۔

''علاج غم دل'' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ پوری کہانی مرکزی کردار شیتل کے گرد گھومتی ہے۔ راوی کی ملاقات اس سے ایک ہوٹل میں ہوتی ہے اور وہ اسے نیک اور با اخلاق انسان تصور کرتا ہے لیکن چند ہی ملاقاتوں کے بعد اسے اپنا موقف بدلنا پڑتا ہے۔ اس کی آوارہ گردی، فضول خرچی اور نئی نئی لڑکیوں کے ساتھ روز نظر آنے کے سبب وہ اسے آوارہ اور بدچلن سمجھتا ہے۔ قاری بھی اس تاثر میں شریک ہو جاتا ہے لیکن کہانی کے آخری مرحلے میں ہوٹل کے منیجر کا بیان پڑھنے والے کو بحر حیرت میں غرق کر دیتا ہے اور وہ یہ جان کر ششدر رہ جاتا ہے کہ شیتل آوارہ یا بدچلن نہیں بلکہ وہ نئی نئی لڑکیوں سے صرف اس لئے دوستی کرتا ہے کہ ان میں اپنی مرحومہ بیوی کے خدوخال تلاش کر سکے۔ کہانی کا تار و پود اس طرح سے بنا گیا ہے کہ قاری شروع سے ہی تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے اور اسے کئی بار اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے۔ کہانی کے اختتام پر قاری تذبذب کی کیفیت سے نجات پاتا ہے اور شیتل کے تئیں قاری کی نفرت، ہمدردی میں بدل جاتی ہے۔ گویا فنی اعتبار سے یہ ایک معیاری کہانی ہے۔

''تبسم کی لکیر'' میں مشرق و مغرب کے تضاد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مسٹر ایم. وسیم جو مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مشرقی تہذیب کے نمائندہ ہیں۔ زندگی کے متعلق ان کا ایک مخصوص نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ کہانی کار ان کا کلاس فیلو ہے۔ مسٹر وسیم راوی کی قدامت پرستی کا مذاق اڑاتے ہیں اور ایک انجان لڑکی کو شریک حیات بنانے کی آمادگی پر لعنت و ملامت بھیجتے ہیں۔ راوی وقتی طور پر مسٹر وسیم کے جملے سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ ماں کی پسند سے ہی شادی کرتا ہے اور اس کی ازدواجی زندگی نہایت کامیاب گزرتی ہے اور تب اس کے ذہن میں مسٹر وسیم کے جملے اکثر

بازگشت کرتے ہیں جواب مکمل طور پر بدل چکے ہیں اور ان کے سوچنے کا انداز بھی۔ ''تبسم کی لکیر'' دراصل اپنے آپ پر ہی ایک طنز ہے۔ اس لئے کہ مشرقیت اپنا جواز رکھتی ہے، اس کا اپنا حسن ہے، اس کو پانے کے لئے عمر اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مجھے مزید یہ کہنا ہے کہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم میں اندھی مغربیت لوگوں کو کس طرح متاثر کر رہی ہے، اس کی ایک پر کشش تصویر اس افسانے میں موجود ہے۔ مسٹر ایم. وسیم آخرش مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے اور اچانک نہیں بلکہ ان کے اپنے تجربات اور مشاہدات نے انہیں مغرب کے بارے میں ان کے اپنے نظریات پر ضرب کاری لگائی۔ نتیجتاً وہ وہاں پہنچ گئے جہاں انہیں پہنچنا چاہئے تھا۔ یہ ایسا نکتہ ہے جس پر ضخیم ناول لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اختصار میں ساری باتیں سمٹ آئی ہیں۔

''اہرمن اور یزداں'' ایک فلسفیانہ نوعیت کی کہانی ہے۔ خیر و شر کی چشمک کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ اس کشمکش میں عارضی طور پر بھلے ہی خیر کی شکست ہو جائے لیکن بالآخر فتح اسی کی ہوتی ہے۔ یہ موضوع کوئی نیا نہیں ہے۔ اسے بہتوں نے فنکارانہ طور پر اپنی کہانیوں میں برتا ہے۔ وہاب اشرفی نے یہاں کمال فنکاری سے زندگی کی ایک عام نہج کی کہانی کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مسٹر بھونسلے اہرمن طبقہ کے نمائندہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ دراصل آدمی کی شکل میں شیطان ہے۔ نہ معلوم کتنی دوشیزاؤں کو محبت و دولت کے دام میں گرفتار کر کے ان کی عزت سے کھیل چکا ہے۔ لیکن رتنا پر اس کا جادو نہیں چلتا۔ جب اس کی تمام تر کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں تو وہ اسے اغوا کرانے کی سعی کرتا ہے اور آخرش اسی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ ظاہر ہے حق و باطل کے روایتی تصادم میں یہاں بھی حق کی فتح ہوتی ہے۔ کہانی کار کا نقطہ نظر نہ تو نیا ہے اور نہ ہی دور از کار۔ اس کہانی میں اگر کوئی ندرت و جدت ہے تو وہ تعمیر ماجرا کی ہے۔

''کوئی غمگسار ہوتا'' ایک مفلس، بے بس اور بے کس ماں کی کہانی سامنے لاتی ہے۔ اس کا بچہ اتنا باشعور ہو چکا ہے کہ وہ اس بات کی نوٹس لیتا ہے کہ اس کی ماں رات کی تاریکی میں کہیں جاتی ہے اور پھر دیر رات تھکی ماندی آ کر سو جاتی ہے۔ افلاس اور عفت ساتھ ساتھ رواں دواں نہیں رہ سکتی۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ غربت، عفت و ناموس کے تمام شاخسانوں کو یکسر باطل کر دیتی ہے۔ ''کوئی غمگسار ہوتا'' ایسے ہی استحصال کی ایک دردانگیز کہانی ہے جس میں زندگی کی تلخی، اس کا

ہیجان، اس کے تضادات، اس کی ناہمواری خوبصورتی سے سمٹ آئی ہیں۔ یہ ایک سب الٹرن موضوع ہے جو آج کچھ زیادہ ہی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ سماجی، احوال و کوائف میں بعض کی پسماندگی متعلقہ طبقے پر محیط ہوتی ہے جس کے خلاف اب لوگ جاگتے نظر آتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے بہت پہلے یہ محسوس کیا تھا جس کی ایک صورت ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' میں ملتی ہے۔

افسانہ ''ستی ساوتری'' کے بارے میں خود افسانہ نگار نے ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء کو مدیر ماہنامہ ''بیسویں صدی'' جناب خوشتر گرامی کے نام لکھے اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ:

> ''ستی ساوتری'' افسانہ نمبر میں آ جائے تو مجھے مسرت ہوگی۔ یہ کہانی شاید الٹرا ماڈرن عورتوں کو کچھ مکدر کر دے۔ لیکن میرے احساسات حقیقی اور ایماندارانہ ہیں۔ خواہ مخواہ کا طنز مقصود نہیں''۔

(دیکھئے مکتوب افسانے کے ساتھ مطبوعہ ماہنامہ ''بیسویں صدی''، افسانہ نمبر، جولائی ۱۹۶۳ء)

میں افسانہ ''ستی ساوتری'' کے باب میں مزید کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہاب اشرفی صاحب کی اس رائے پر صاد کرتا ہوں۔

افسانہ ''ایک سایہ'' کا رومانی ماحول مزاح کے پس منظر میں مرتب ہوا ہے۔ اس کہانی کے انجام میں ایک غیر متوقع حزن ہے جس سے قاری کے ذہن کو زبردست جذباتی جھٹکا لگتا ہے اور اختتام پر اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک کامیاب کہانی ہے۔

کہانی ''سکنڈ سیکس'' آج کی تانیثی تحریک کا ایک پہلو پیش کرتی ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کہانی کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ واضح رہے کہ یہ کہانی ''دونوں رخ'' کے عنوان سے رسالہ ماہنامہ ''صنم'' پٹنہ کے ستمبر ۱۹۵۸ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ اب وہاب اشرفی کی خواہش کے مطابق اس کا عنوان تبدیل کر کے ''سکنڈ سیکس'' کر دیا گیا ہے۔

ایک مختصر سے مقدمے میں ہر کہانی کا تجزیہ تو ممکن نہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہانیاں متنوع موضوعات کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں میں دیہی زندگی کے مستقل مسائل بھی ہیں اور شہری زندگی کا حال زار بھی۔ ان کے واقعات پیچ دار نہیں لیکن زندگی کے عوامل سے بھرپور ہیں۔ وہاب اشرفی فطری طور پر رومان پسند ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی جتنی بھی مقصدی کہانیاں ہیں، ان میں بھی جنسی احساسات اور رومان پسندی سے ان کے کردار بچ نہیں سکے ہیں لیکن یہ تصورات بڑے محتاط انداز کے ہیں۔ ان میں ہیجانی کیفیت نہیں، ایک حسن اور ایک لذت ہے اور

یہ لذت بھی صحت مند جذبات واحساسات میں مبدل ہو جاتی ہے۔ وہ کسی اجنبی ماحول کو پیش نہیں کرتے۔ ان کی کہانیاں زیادہ تر گھریلو واقعات کے گرد گھومتی ہیں لیکن تجربات ومشاہدات سے بھرپور ہیں اور اپنے اندر بڑی دلچسپیاں رکھتی ہیں۔ ان میں رومانی، سماجی اور تہذیبی اقدار ہیں۔ معاشرے کی ناہمواریوں اور سماج کی ناانصافیوں پر وہ کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کی جزئیات نگاری ان کی کہانیوں کا حسن ہے اور ان کے کردار جامد نہیں بلکہ جیتے جاگتے اور حقیقت پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ بقول ڈاکٹر مناظر حسن:

''ان کے یہاں قدیم دیہاتی اوہام کے تراشے ہوئے کردار بھی ملتے ہیں اور ماڈرن شہری زندگی سے تعلق رکھنے والے اشخاص بھی، مفلسی کا شکار اللہ رکھو بھی ہے، جسے اپنے ہی داماد کے لئے آخری قبر کھودنی پڑتی ہے، اور دولت میں کھیلنے والے مسٹر بھونسلے بھی ہیں، جو عورت کو بستر کی چادر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، احسان فراموش فلمی اداکارائیں بھی ہیں اور خودغرض اور موقع پرست کہانی نویس بھی، بے وفا مرد بھی ہیں اور عصمت فروش عورتیں بھی، غرض یہ کہ زندگی کے بہت سارے رنگ، بہت سارے پہلو ان کے افسانوں میں سمٹ آئے ہیں، پھر یہ بھی ہے کہ ہر حال میں ان کے افسانوں کا انجام یکساں نہیں ہوتا، کبھی وہ المیے پر ختم ہوتے ہیں اور کبھی وصال پر، ایسی صورت میں ہم وہاب اشرفی کو کسی ''ازم'' کا شکار نہیں کہہ سکتے، بلکہ ایک ایسا افسانہ نگار قرار دے سکتے ہیں جس نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی کی عکاسی کی ہے، بڑے خلوص اور بڑی ہمدردی کے ساتھ ہر واقعے کا جائزہ لیا ہے اور اسے اپنے نقطہ نظر سے افسانے کے قالب میں ڈھال دیا ہے''۔

(''وہاب اشرفی: شخصیت اور فن''، ڈاکٹر مناظر حسن، ص: ۷۴-۷۵)

وہاب اشرفی کی کہانیوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا چونکا دینے والا نقطہ عروج ہے۔ علاوہ ازیں وہ عنوان کو اپنی کہانی کے واقعات کا اشاریہ بھی بنا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''ایک نقش جاوداں'' سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف کی محبت کا جو نقش ہیروئن کے دل میں ابھرا تھا وہ نقش جاوداں تھا۔ ''گرگٹ کے خطوط'' کا مرکزی کردار وحشی عظیم آبادی گرگٹ کی مانند رنگ بدلتا ہے۔ ''مٹی کا مادھو'' کہانی کے نامرد ہیرو کی صحیح لفظی تصویر ہے۔ ''اپنی اپنی راہ'' اس حقیقت کو عیاں کر دیتا ہے کہ اداکارہ اور افسانہ نگار دونوں اپنے مقصد و مفاد کے لئے اپنی اپنی راہ پر چل رہے ہیں۔

''پچیسویں قلوپطرہ'' کی ہیروئن انگبین اپنے شوہر کے تصرف میں آنے والی حسیناؤں میں معیار حسن کے اعتبار سے پچیسویں نمبر پر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہی حال ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا''، ''چراغ پرانا، شمع نئی''، ''ایک شرط، ایک امتحان''، ''ایسا چہرہ، ایسا دل''، ''ایک چوٹ، ایک موت''، ''چھی چھی، توبہ توبہ''، ''دامنِ مریم''، ''تھرٹی روپیزنٹ'' وغیرہ کا بھی ہے جس کے عنوانات واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وہاب اشرفی عورتوں کی مختلف نفسیاتی کیفیات کو اپنی کہانیوں میں نہایت کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔ ''ایک نقش جاوداں'' کی بیگم انور، ''چراغ پرانا، شمع نئی'' کی جنت نانی، ''چھوٹی بہو'' کی منگلن نانی، ''مٹی کا مادھو'' کی باندی، ''ایک شرط، ایک امتحان'' کی مس سوزی مختلف ماحول اور سماجی سطح سے تعلق رکھنے والی عورتیں ہیں لیکن کہانی کار نے جس طرح ان کی تحلیل نفسی اور جذبات نگاری کی ہے اس سے اس باب میں ان کی مہارت تامہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

وہاب اشرفی کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی اکثر کہانیوں میں اسم بامسمّٰی کردار مل جاتے ہیں۔ باندی نوکرانی ہے اور نوکرانی رہتی ہے۔ شریف اپنے نام کی مناسبت سے شریف ہے اور بغیر جہیز لئے شادی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ شیتل بالکل پاک صاف اور بے داغ کردار کا مالک ہے۔ اس قبیل کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

وہاب اشرفی کی کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے فن پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور مختصر جملوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرتے ہیں۔

> ''یوسف کی نظریں جو مجھے ٹٹولنے لگیں تو شرم وحیا کے احساس کے باوجود نگوڑی مسکراہٹ دانتوں اور ہونٹوں کے درمیان مچل گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دل کی دھڑکنیں رنگین اور خوشبودار لفافے میں بند نہ کی جاتیں''۔　　(''ایک نقش جاوداں''، ص:۱۵۵)

وہاب اشرفی کے چھوٹے چھوٹے شگفتہ، چست اور چبھتے ہوئے جملے ہر کہانی میں ملتے ہیں۔ وہ بڑی رواں اور برجستہ نثر لکھتے ہیں۔

> ''آج چار روز ہو گئے پر چھوٹی بہو کو کچھ نہ ہوا۔ مریم دادی کا سارا تجربہ ناکام ہو گیا۔ بڑی بھابھی کو سکتہ آ گیا۔ شریفا بوا کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے اور منگلن نانی نے درگاہ اور حکمت شاہ کے دروازے ایک کر دیئے۔ حکمت شاہ نے پورے پچاس روپے لئے اور

دس بار پانی پڑھا اور پانچ نئے تعویذ دیئے۔ گڑ کے بدلے چینی پر دم کیا اور چھوٹی کو کھلایا۔ تقریباً پاؤ بھر خاک شفا پانی میں گھول گھول کر چھوٹی کو پلا دی گئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا''۔
تین گھنٹے تک معالج چھوٹی کے علاج میں لگے رہے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ چھوٹی کو تین ہچکیاں یکے بعد دیگرے آئیں اور وہ مرگئی''۔　　(''چھوٹی بہو''، ص:۸۳)

وہاب اشرفی کے یہاں تجربات ومشاہدات کی پختگی کے علاوہ زبان، الفاظ، روزمرہ اور محاوروں کی صحت بدرجہ اتم ملتی ہے۔ عام طور پر اچھے اچھے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ احتیاط نہیں ہوتی۔ ایک اقتباس دیکھئے:

'' کچی عمر میں آئینہ دیکھنا تو بس آفت ہے۔ کم بخت جلدی جلدی کیسی کیسی باتیں بتانے لگتا ہے۔ ایسی ایسی باتیں کہ توبہ بھلی، کوئی شرم سے پانی پانی نہ ہو جائے تو کیا ہو، کہنے کو تو بے جان شیشہ ہوتا ہے پر ایک دم سے سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جب چہرے پر سرخی دوڑنے لگے، آنکھیں خمار آلود ہو جائیں، تنفس کا زور بڑھ جائے، انگڑائی سی آنے لگے تو بھاگ کر پلنگ پر اوندھی گر جانے کے سوا چارہ بھی کیا رہ جاتا ہے لیکن بھاگنے کے بعد بھی سکوں مل جائے تو ایک بات ہو''۔　　(''ایک نقش جاوداں''، ص:۱۵۵)

ان کے جملے کہیں کہیں اتنے بلیغ اور شگفتہ ہوتے ہیں کہ وہ نثر کی شاعری معلوم ہوتے ہیں:

(۱)　''حسین عورت اپنا پسینہ پونچھنے لگی۔ رومال سے خوشبو کی لہر اٹھی اور بس میں رقص کر گئی''۔
(''تھرٹی روپیز نٹ''، ص:۱۷۵)

(۲)　''آخری لفظ نکالتے ہی افتخار نانا خود جاں بحق ہو گئے اور میری آنکھوں میں سیلاب امنڈ آیا''۔
(''کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے''، ص:۷۳)

(۳)　''باندی نے ہوش سنبھالا تو نوکرانی تھی۔ جب اس نے ہوش نہیں سنبھالا تھا تب بھی نوکرانی تھی''۔

خوشبو کی لہر کا بس میں رقص کرنا، آنکھوں میں سیلاب امنڈ آنا اور غلام پیدا ہونا اور غلام ہی مر جانا، یہ ایسی کیفیات ہیں جنہیں پیش کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ انہیں پیش کرنے کے لئے دردمند دل اور تخلیقی ذہن درکار ہے۔

''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' وہاب اشرفی کی ۳۰ کہانیوں اور ایک ڈراما کا مجموعہ ہے۔ ان میں کوئی کہانی ایسی نہیں ہے جو قاری کو محظوظ نہ کرتی ہوں۔ یہ کہانیاں دلچسپ ہی نہیں

ہیں بلکہ ان میں مقصد کے ساتھ نفسیات کی گہرائیاں اور گیرائیاں بھی ہیں۔ ان میں ہماری روزمرہ کی زندگی کی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

یہ مختصر سا جائزہ افسانہ نگار وہاب اشرفی کے فکر وفن کی کلی وضاحت نہیں کرتا، نہ ہی وہ تحقیقی مقالہ جس پر محمد امجد حیات برقؔ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے، نہ ہی ڈاکٹر احمد حسین آزاد، ڈاکٹر مناظر حسن اور کے وہ مقالات جن میں ان کی افسانہ نگاری سے بحث کی گئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ موصوف کے افسانوں کا کماحقہ جائزہ لیا جائے اور تمام تکنیکی اور فنی صورتوں کو سامنے لایا جائے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کے مقبول ڈراما ''سب خیریت ہے'' کو شامل کرتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ انہوں نے یہ ڈراما اس وقت لکھا تھا جب وہ رانچی میں تھے۔ یہ شاید ۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ انہوں نے قومی فلم فیسٹیول کے لئے یہ ڈراما لکھا تھا جو سب سے پہلے رانچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔ اس کے بعد متعدد ریڈیو اسٹیشنوں سے یہ ڈراما برابر نشر ہوتا رہا اور خاصا مقبول بھی ہوا۔ وہاب صاحب بتاتے ہیں کہ جب چیک آتا تھا تو اس سے یہ انکشاف ہوتا تھا کہ فلاں ریڈیو اسٹیشن سے یہ نشر ہوا۔ یہ ڈراما حال تک غیر مطبوعہ تھا۔ اس لئے کہ موصوف نے اشاعت کے لئے اسے کہیں بھیجا ہی نہیں تھا، پھر مسودہ بھی کہیں گم ہو گیا۔ حال ہی میں ان کے چھوٹے صاحبزادے سید شہیر اشرفی کی تحویل سے مجھے اس کا مسودہ ملا تھا تو میں نے اسے ''مباحثہ'' شمارہ ۲۳ر جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء میں شائع کر دیا تھا۔ اس طرح یہ ڈراما محفوظ ہو گیا۔

''سب خیریت ہے'' اپنے مسائل اور حقائق کے بیان میں بے حد مثالی ڈرامہ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر اچھی فلم سازی ہو سکتی ہے یا اسے مختلف سیریلس میں ٹیلی کاسٹ کیا جا سکتا ہے۔ وہاب اشرفی صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے صرف یہی ایک ڈراما لکھا ہے۔ ویسے غالب کے حوالے سے ان کی ایک تمثیل، سہیل عظیم آبادی نے پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھی۔ یہ تمثیل تقریباً ۴۵ منٹ کی تھی۔ اس کا مسودہ بھی نایاب ہے۔ تلاش میں لگا ہوا ہوں۔

وہاب اشرفی صاحب نے سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، پروفیسر سید حسن، اختر قادری وغیرہ جیسے اہل قلم پر عمدہ خاکے بھی قلم بند کئے ہیں۔ ان کے بعض خاکے تلاش بسیار کے بعد مجھے مل چکے ہیں۔ ان کا بھی ایک مجموعہ جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔

سب سے پہلے میں جناب سید انظر حسین، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ اور

جناب حسن احمد، لائبریرین، گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ کا ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے مواد کی فراہمی میں میری معاونت کی۔ محترم ابوذر ہاشمی، نیشنل لائبریری، کولکاتا اور برادرم عبدالسمیع، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے نیشنل لائبریری، کولکاتا اور دہلی کی بعض لائبریریوں میں محفوظ بعض رسائل و جرائد میں گم وہاب اشرفی کی چند نایاب کہانیوں کی فوٹو کاپی میرے لئے حاصل کی جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ میں شکر گذار ہوں برادرم عالم خورشید، کوثر مظہری اور مولا بخش کا جنہوں نے مقدمہ اور دیگر تحریر کو بہ اصرار سنا اور اپنی رائے دینے سے گریز نہیں کیا، بے تکلف اس کا اظہار کیا۔

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں حاجی محمد مجتبیٰ خاں اور حاجی مصطفےٰ کمال پاشا، مالکان ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی اور برادرم محمد سبحان کا شکریہ ادا نہ کروں جن کے تعاون سے کتاب کی دلکش اشاعت اور جاذب نظر تزئین ممکن ہو سکی۔ کمپیوٹر کمپوزر برادرم تنویر احمد نے نہایت خلوص، انہماک اور جانفشانی سے اس کتاب کو کمپوز کیا، ان کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے۔ میں اپنی شریک حیات نگار ینہ اشرف کا، جنہوں نے کتاب کی پروف ریڈنگ بھی کی، سے اظہار تشکر نہ کروں تو شاید مناسب بات نہ ہوگی۔ بیٹے سید ذیجاہ اشرف اور بیٹی نازاں اشرف کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھ کو گھریلو کاموں کی ذمہ داریوں سے فارغ کر کے ایک ایسا علمی اور پر سکون ماحول فراہم کیا جس میں یہ کام بطریق احسن تکمیل کو پہنچ سکا۔

امید قوی ہے کہ افسانوی ادب میں ''کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا'' قدر و منزلت حاصل کرے گا اور نقادوں کو وہاب اشرفی کے فنی رموز اور تخلیقی انفرادیت و عظمت کا احساس دلائے گا۔ ویسے بعض پرانے افسانہ نگار اور نقادان فن آگاہ ہیں کہ وہاب اشرفی بہت دنوں تک افسانہ لکھتے رہے اور کامیاب بھی تھے کہ اچانک انہوں نے اس فن سے رشتہ توڑ لیا۔ شاید اس ضمن میں خاموشی سے کوئی بڑا کام کر رہے ہوں یعنی کہ ناول لکھ رہے ہوں، مجھے کچھ بتایا نہیں۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

۵/اپریل ۲۰۱۱ء

پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو

ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ (جھارکھنڈ)

☆☆

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

''کہاں ہو جی چھوٹی، بڑی ادھر آؤ، ہائے اللہ کیسا زمانہ آیا ہے، حد ہے بھلا''۔
بڑی امّاں گرتی پڑتی، ہلتی، ہانپتی دروازے سے آنگن میں آئیں اور اپنی دونوں بہوؤں کو پکارا۔

بڑی بھابی جلتے توے پر روٹی چھوڑ کر بڑی امّاں کی طرف بھاگیں اور چھوٹی بھابی نے مشکل سے اپنی ہنسی روکی اور چھوٹے بھیّا سے اپنا دوپٹہ چھڑاتے اور سنبھالتے بڑی امّاں کے پاس آ گئیں۔

''میں کہتی ہوں کہ اب قیامت نزدیک ہے۔ ان بوڑھی آنکھوں کو کیا کیا نہ دیکھنا پڑے گا، توبہ ہے.....'' بڑی امّاں کی سانسیں اب تک تیز چل رہی تھیں۔
''لیکن بات کیا ہے؟'' بڑی بھابی جلد ہی کچھ سن لینا چاہ رہی تھیں۔
''ہاں ہوا کیا؟'' چھوٹی بھابی کو بھی عجلت تھی کہ چھوٹے بھیّا ان کا انتظار کر رہے تھے۔
''کیا پوچھتی ہو بہو۔ کہانا قیامت کو اب دیر نہیں ہے۔ جو کچھ دیکھا یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔'' بڑی امّاں کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔
''اب کہیے بھی''۔ چھوٹی بھابی دق ہو کر بولیں، اور بڑی بھابی کے ذہن میں بہت سی باتیں آ گئیں۔

کہ آج پھر کلوا کی بیوی تیل سے نہائے بالوں والے شہری لونڈے سے آنکھیں لڑاتے ہوئے پکڑی گئی۔

کہ شاہ اللہ رکھے کی بیوی نے پھر اس کی داڑھی پکڑ لی اور میلی ٹوپی سے اس کی ڈھکی ہوئی چکنی چندیا پر بے تحاشہ جوتیاں برسائیں۔

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

میں جیسے ہی دروازے سے گلی میں گئی، دیکھا سوٹ بوٹ پہنے ادھر ہی آرہا ہے، ایک دم صاحب کی طرح۔ میں جو پردے کے لئے بھاگی تو وہ بول پڑا۔ ''ہم ہیں دادی، ہم ہیں دادی'' تب میں نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ جانتی ہو وہ گنیشوا تھا، بڑی امّاں نے تفصیل بتائی۔

''کون گنیشوا؟ پریگوا کا بیٹا؟''۔ بڑی بھابی نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔

''گنیشوا پاسی اور ایک دم صاحب کی طرح''۔ چھوٹی بھابی کو بھی جھٹکا لگا۔

''ہاں ہاں لونڈا گنیشوا ہی تھا، تب ہی کہا قیامت اب آچلی۔ دونوں پاؤں میں انگریزی بوٹ جوتا، اس کے اندر اچھا اچھا پیتاوا، ہاتھ میں سونے کی طرح ایک دم سے چمکتی ہوئی گھڑی، اپنے چھوٹے کی طرح کوٹ پہنے، بال جھاڑے، آنکھ پھاڑے، میرے سامنے کھڑا ہو گیا'' اور بڑی امّاں سانس لینے کو رُکیں۔

''اب ہم شریف لوگوں کی زندگی تلخ ہے''۔ بڑی بھابی مایوسی کے عالم میں بولیں۔

تب ہی تو بھیّا یہاں سے چلے گئے۔ اب امّاں کو خرچ نہیں بھیج پاتے تو کیا ہوا، کسی طرح زندگی کٹ جائے گی، پاؤں تو قبر میں لٹکا ہی چکی ہیں، چھوٹی بھابی کو آج موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے رویّہ کے حق میں کچھ کہہ دیں۔ دراصل ان کے اکلوتے بھائی اپنی بیوی کے ساتھ پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں جا کر اپنی بوڑھی ماں کو قطعی بھول گئے تھے۔

''اب تم اپنے بھائی کی بڑائی مت کرو، لیکن اتنی بات درست ہے کہ ہم شریفوں کی مٹی یہاں بھاری ہے، بڑی امّاں نے چھوٹی بھابی کو خاموش کر دیا۔ اس لئے کہ ان کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ چھوٹے بھیّا اپنی ساس کے اخراجات کا بار اٹھائے ہوئے ہیں اور بڑی امّاں نے پھر کہا۔ ''لونڈے نے قریب آکر مجھے سلام کیا۔ میں نے پوچھا تو ہے موئے گنیشوا؟ تو وہ ہنسا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا''۔

اتنا کہہ کے بڑی امّاں دروازے کی طرف لپکیں، انہیں ابھی پڑوس کو یہ خبر دینی باقی تھی۔ ویسے انہیں رہ رہ کے یہ خیال آرہا تھا کہ اس وقت بڑے ابّا ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا، انہیں یہ سب کچھ بتایا جاتا، اس گاؤں میں اب شریفوں کی عزّت کہاں رہی جو پاسی اس انداز سے رہے۔

کچھ ہی دیر میں بڑی امّاں گنیشوا کے بارے میں ساری باتیں محلّے کو سنا آئیں اور جب تھک گئیں تو جائے نماز پر بیٹھ گئیں۔

بڑے ابّا بڑی دیر سے آئے۔

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

''اجی سنتے ہو، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور تم ہو کہ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہو''۔ بڑی اماں کو حقے سے ہمیشہ سے چڑ رہی تھی۔

''کہو گی بھی، دنیا کو کیا ہو گیا''۔ بڑے ابا نے حقہ کا ایک زوردار کش لیا اور دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔

''وہ جو پریگوا کا لونڈا ہے نا، شہر سے آیا ہے۔ صاحب بہادر بن کے، اپنے چھوٹے کی طرح سوٹ بوٹ میں''۔ بڑی اماں نے آخر خبر دے دی۔

بڑے ابا کو یہ بات بڑی بری لگی کہ بڑی اماں نے گنیشوا کو ان کے چھوٹے سے ملا دیا۔ ویسے یہ خبر ان کے لئے نئی نہیں تھی۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ گنیشوا بڑی شان سے پورے سات برس بعد گاؤں واپس آیا ہے۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ اس نے ایم.اے. تک پڑھ لیا ہے اور اب پٹنہ میں کسی دفتر میں ملازم ہے۔

''صاحب بن گیا تو کیا ہوا، ہے تو پاسی ہی''۔ بڑے ابا کو کچھ جواب دینا تھا سو انہوں نے دے دیا اور بڑی اماں جیسے مطمئن ہو گئیں کہ چلو کچھ بھی ہو لیکن یہ کمبخت اپنی ذات تو نہیں بدل سکتے۔ لیکن اسی دوران بڑے ابا کو کچھ پچھلی باتیں یاد آنے لگیں۔ ان کے منہ کا حقہ منہ ہی میں رہا اور چلم ٹھنڈی ہو گئی۔ بدتمیزوں کے پر نکل آئے ہیں۔ آسی پاسی بھی پڑھنے لگے۔ کیسی آزادی ہے توبہ، نہ چھوٹے کی تمیز، نہ بڑے کی۔ اور پہلے کا زمانہ! اسی گنیشوا کے دادا کو پائے سے باندھ کر مارا تھا، میں اس کے گھر کی طرف سے گزرا تھا تو وہ پلنگ سے اٹھا نہ تھا۔ لعنت ہے آج کی زندگی پر، کیسا زمانہ ہے یہ، اور زبو کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ یہاں تحویل میں کچھ نہیں ہے۔ جانے زمینداری کا کمپن سیشن کب ملے۔ لڑکے والوں کی طرف سے جلدی بھی ہے، پھر زبو کا اکیسواں چڑھ رہا ہے۔ آٹھ دس ہزار روپے تو خرچ ہوں گے ہی۔ بڑے ابا سوچتے سوچتے ایک دم گھبرا گئے۔

اور جب انہیں آج معلوم ہوا کہ ان کی پرانی حویلی کے سامنے گنیشوا ایک پختہ مکان بنانے کا ارادہ کر رہا ہے تو ان کا پارہ ایک دم سے چڑھ گیا اور زمینداری کے وقت کا جلال ایک بار پھر آ گیا۔ انہوں نے فوراً اپنے نوکر کو آواز دی اور پریگوا کو بلا بھیجا۔

پریگوا حاضر ہوا۔

''تیرا لڑکا شہر سے آ گیا ہے نا؟'' بڑے ابا پریگوا سے بولے۔

''ہاں سرکار''۔ پریگوا اب بھی ان سے ڈرتا تھا حالانکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

''تیرا کوئی پختہ مکان میری حویلی کے پاس بن رہا ہے؟'' بڑے ابا کی آواز رعب دار تھی۔

''ہم نہ جانیں سرکار، اوتو چھٹکا..... چھٹکا''۔ پریگوا ہکلانے لگا۔

''ارے تیرے بیٹے نے ذرا سا پڑھ کیا لیا کہ اس کا دماغ آسمان پر چڑھ گیا۔ اچھا تو اسے ابھی یہاں بھیج''۔ اور پریگوا سر جھکائے گھر واپس چلا گیا۔

''آداب دادا!''۔ اور گنیشوا کا یہ طرزِ تخاطب بڑے ابا کو ذرا بھی نہیں بھایا۔ اب تک تو وہ پاسیوں سے سرکار ہی سنتے آئے تھے، پھر بھی وہ گنیشوا پر یکا یک برس نہ سکے۔ گو کہ ان کا لہجہ ان کے اختیار میں نہ تھا۔ بولے ''تو شہر سے کب آیا؟''

''ایک مہینہ ہو گیا، بس دوسرے وِیک میں چلا جاؤں گا''۔ اب کے دادا کو گنیشوا کا اندازِ گفتگو بالکل اپنے چھوٹے کی طرح معلوم ہوا۔

''سنا ہے میری حویلی کے سامنے اینٹ کا مکان بنا رہا ہے''۔ بڑے ابا نے جل بھن کر پھر ایک سوال کیا۔

''جی ہاں! ارادہ تو ہے، لیکن آپ کی حویلی تو''۔ گنیشوا نے بڑے اطمینان سے سب کچھ کہہ دینا چاہا لیکن بڑے ابا برس پڑے۔

''ابے تیرے باپ دادا کبھی اینٹ کے مکان میں رہے تھے؟ پھر میری حویلی کے سامنے، یعنی۔یعنی''۔ بڑے ابا کے ضبط کی قوت ختم ہو گئی۔

''وہ تو سب کچھ درست ہے پر آپ کی حویلی میرے مکان سے کافی دور رہے گی۔ اچھا میں پھر کبھی آؤں گا''۔ بڑے ابا گنیشوا کی ایسی بے باک گفتگو سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور اسے راہِ راست پر لانے کی اسکیم سوچنے لگے کہ ڈاکیے نے لفافہ دیا۔

لفافہ چاک کر کے انہوں نے خط نکالا اور پڑھا، ایک بار اور پڑھا۔ پھر ان کا منہ ایک دم اُتر گیا۔ زبیدہ کا جہاں رشتہ ہونے والا تھا خط وہیں سے آیا تھا۔ لڑکے والوں نے لکھا تھا کہ اگلے تین ماہ کے اندر شادی نہیں ہوئی تو پھر نسبت کو ختم سمجھنا چاہئے۔

خط کا مضمون فوراً ہی بڑی امّاں کو معلوم ہو گیا۔ بڑی امّاں نے بڑی بھابی کے کان میں کچھ کہا، بڑی بھابی چھوٹے بھیّا سے کچھ بولیں، چھوٹے بھیّا نے زبیدہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر جلدی سے گھر سے باہر نکل گئے۔

بڑے ابا کو زمینداری کے کمپن سیشن سے چار پانچ ہزار روپے مل سکتے تھے۔ زبیدہ کی

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

شادی ان ہی روپوں سے انجام پا سکتی تھی۔ بڑے بھیّا اسکول میں پڑھاتے تھے۔ انہیں جو رقم ماہانہ ملتی تھی خود ان کے اخراجات پورے نہیں کر پاتی تھی۔ چھوٹے بھیّا ریلوے میں ٹی.ٹی.ای. ہو گئے تھے۔ ان کے سر پر ان کی ساس کے اخراجات بھی تھے اور ملازمت بھی نئی تھی۔

اور تب شام کے وقت ایک جگہ بڑے ابّا، بڑی امّاں، بڑے اور چھوٹے بھیّا بیٹھے۔ پہلے آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں۔ پھر باتیں زور زور سے ہوئیں۔ بڑے بھیّا نے کسی قسم کی مدد سے اپنے آپ کو بالکل معذور ثابت کیا، چھوٹے بھیّا نے اصرار کیا کہ زبیدہ کی سسرال والوں کو لکھا جائے کہ وہ کم از کم دو سال اور انتظار کریں۔ بڑی امّاں کسی بات سے بھی مطمئن نہیں ہوئیں اور آخر یہ فیصلہ ہوا کہ بڑے ابّا کمپن سیشن کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ بات یہ طے پائی کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو جب بڑے بھیّا کی تنخواہ ملے تو بڑے ابّا کچھ روپے لے کر پٹنہ چلے جائیں اور وہاں زمینداری کمپن سیشن کے افسر سے خود ملیں۔

بڑے ابّا پٹنہ آ گئے۔

انہیں کمپن سیشن افسر سے ملاقات کرنے میں بڑی ہی مشکل پیش آئی۔ دفتر کے ایک کلرک نے دوسرے کلرک کی میز کی طرف اشارہ کیا کہ کاکو برانچ کا کیس وہ دیکھتے ہیں۔ اس طرح انہیں بہت سی میزوں سے گزرنا پڑا۔ آخر کار ایک کلرک نے تفصیل بتائی کہ ان کے کاغذات ابھی ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ اس طرح پیسے کی نکاسی میں ایک عرصہ لگ جائے گا۔

بڑے ابّا پہلے تو ایک دم مایوس ہو گئے، لیکن پھر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کمپن سیشن افسر سے براہِ راست مل لینے کے لئے چپراسی کے ذریعہ سلپ بھجوائی۔ انہیں چیمبر میں چلے جانے کی اجازت مل گئی۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' بڑے ابّا غیر ضروری اجازت چاہتے ہوئے کچھ گھبرا سے گئے۔

''یس. کم اِن''۔ اندر سے ایک آواز آئی۔

جیسے ہی وہ کمرے کے اندر داخل ہوئے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہاں گنیشو ابیٹھا تھا۔

''ت.....ت.....م.....آپ'' بڑے ابّا ہکلا گئے۔

''دادا نمستے، آپ نے کیسے تکلیف کی''۔ گنیشو فوراً کرسی سے اٹھا اور بڑے ابّا کو شانہ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر گھنٹی بجائی اور چپراسی کو ناشتہ لانے کے لئے کہا۔

جب بڑے ابّا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تو پیشانی سے پسینے کے قطروں کو رومال سے

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

جذب کرتے ہوئے پوچھا ''آپ یہاں کس طرح؟''

''جی میں یہاں کمپن سیشن افسر ہوں۔ آپ کا کوئی کام ہے کیا؟''

بڑے ابا نے تفصیل بتادی۔

دوسرے ہی دن جب پانچ ہزار کا چیک گنیشوا نے دستخط کر کے بڑے ابا کے حوالے کیا تو ان کا سر ایک دم سے جھک گیا۔ انہوں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بڑی عقیدت سے گنیشوا کو دیکھا اور بڑی مشکلوں سے اتنا کہا۔ ''میں آپ کا ممنون ہوں گنیش بابو''۔

زبیدہ کی ڈولی رخصت ہوگئی تو بڑے ابا پریگوا کے یہاں گئے جو اپنے نئے مکان میں منتقل ہو چکا تھا۔

''نیا مکان مبارک ہو پریاگ چودھری.....اور ہاں گنیش بابو کو خط لکھو تو میرا سلام ضرور لکھنا'' بڑے ابا بولے۔

پریگوا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح بڑے ابا کا منہ تکنے لگا اور بڑے ابا فخر سے سینہ پھلائے اور سر اٹھائے اپنی حویلی میں واپس آ گئے۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''آجکل'' جنوری ۱۹۶۵ء، دہلی)

چھی چھی، توبہ توبہ

''حد ہے بھلا، چھی چھی توبہ توبہ'' دادی نے وضو ختم کرتے ہوئے بڑی حقارت سے کہا۔
''ارے کلموہی کے لچھن شروع ہی سے بتاتے تھے کہ یہ کم ذات کچھ گل کھلا کے رہے گی'' اماں نے برا سا منہ بنا دیا۔

''وہ اس کا بننا سنورنا، اٹھلا کے چلنا، آنکھوں میں پھیلا پھیلا کاجل، میں تو تب ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ کوئی مردوا پھانس لے گی۔'' استانی جی نے اپنی پنڈلی کھجاتے ہوئے پان کی پیک دیوار پر پھینک دی۔

''میں کہتی ہوں کہ حرامزادی کو یار ہی کرنا تھا تو مہینہ دو مہینہ صبر کر لیتی، ابھی اس کے بھتار کو مرے جمعہ جمعہ آٹھ ہی دن تو ہوئے ہیں، عدت کی مدت تو کاٹ لیتی حرافہ''۔ دادی جائے نماز بچھاتے ہوئے بولیں۔

''اب چپ بھی رہو لتاں، ان نیچ عورتوں کا یہی حال ہے، ایک مرا، دس کر لئے''۔ اماں نے قصہ ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو بھابی، یہ کم ذات دو کوڑیوں کی ہوتی ہیں، جس نے مٹھی گرم کر دی اسی کی ہو گئیں''۔ استانی جی نے ایک بار پھر دیوار پر پیک پھینک دی اور اپنے ڈھلکتے ہوئے دوپٹے کو سینے پر ٹھیک کر لیا۔

''اچھا ہوا، کالکھ لگونی بستی سے دفان ہو گئی، ورنہ ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی''۔ دادی اب نماز شروع ہی کرنے والی تھیں۔

''ہاں ہاں یہ بہت اچھا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے ہی کتنی جوان جہان لڑکیاں ہیں، جانے ان پر کیا اثر پڑتا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ یار کے ساتھ نکل بھاگی کمینی''۔ اماں نے دادی کی باتوں سے

ایک بار پھر اتفاق کیا۔

لیکن اس بار اُستانی جی نے کچھ نہیں کہا، وہ چپ ہوگئیں، بالکل چپ۔

دادی اماں اور شاید اُستانی جی کو اچانک ہونے والے واقعے سے بڑا صدمہ پہنچا تھا، گھر ہی کی دائی برفتنی آج پڑوس کے نائی گل محمد کے ساتھ فرار ہوگئی تھی اور واقعی یہ صدمہ کی بات بھی تھی، برفتنی کو دادی ہی نے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ جب وہ اتنی سی بچی تھی تو اس کی ماں شبراتن دیا مرگئی تھی تب سے اس کی دیکھ بھال دادی ہی کے ذمہ تھی۔ آخر گھر کی پرانی آیا کی بیٹی تھی، اب اس حویلی کے لوگوں کے علاوہ اس دنیا میں اس کا تھا ہی کون؟ سو دادی نے اس کی پرورش کی اور جوان کیا، جب یہ اٹھارہواں سال طے کر چکی تو ایکدم سے جھاڑ پہاڑ ہوگئی۔ ناک نقشے کی ایسی تیکھی نکلی کہ اکثر حویلی کی بہو بیٹیوں کی ناک کاٹنے لگی، جوانی اس کے انگ انگ پر ٹوٹ کر برسی، حویلی کی محض ملازمہ ہونے کے باوجود اپنے بارے میں وہ قدرت کی فیاضی سے آگاہ تھی۔ کام کاج سے فرصت پاتے ہی وہ کنگھی چوٹی میں الجھ جاتی۔ کاجل لگانے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں پر سیاہ لکیریں بڑا ہی غضب ڈھاتیں۔ بناؤ سنگار کا یہ عالم دادی کو پھوٹی نظروں نہ بھاتا اور وہ اکثر اس پر برس پڑتیں۔ کنواری لڑکیوں کا اس طرح اپنے کو لئے دیئے رہنا ان کے آگے بڑی بری بات تھی، یہ بات انہیں اور بھی بری لگتی جب وہ خیال کرتیں کہ برفتنی شبراتن کی بیٹی ہے جوان کی آیا رہی تھی اور بس۔ لیکن پالنے پوسنے سے انہیں کچھ محبت تو ہو ہی گئی تھی اور اب وہ ننھی سی بچی جوان ہو کر بانس برابر ہوگئی تو انہیں اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی دامن گیر ہوئی، تب سے وہ مناسب لڑکے کی ٹوہ میں لگ گئی تھیں۔ جب برفتنی اپنے کو سنوارنے میں غایت درجہ دلچسپی لینے لگی تو ان کی فکر میں اور اضافہ ہوا۔ لڑکی تھی کہ پھن پھیلانے پر ہر وقت تیار اور دادی کو اس کے لئے مناسب لڑکے کی تلاش۔ خیر سے جمرتیا ان کی نظروں میں جچ گیا اور دادی نے فوراً اس کے پلّے اسے باندھ دیا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، جمرتیا شادی کے بعد صرف تین سال جی سکا اور ہیضہ کی وَبا کا شکار ہو کر مر گیا۔ یہ حادثہ آج سے پندرہ دن پہلے ہوا تھا۔

لیکن آج حویلی کے لئے جمرتیا کی موت سے زیادہ بھیانک حادثہ ہوگیا تھا۔ برفتنی رات ڈھلے گل محمد کے ساتھ فرار ہوگئی تھی، اور دادی اماں اور اُستانی جی کو سخت صدمہ ہوا تھا۔

دادی کو تعجب تھا کہ برفتنی نے ان کی تربیت کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا، انہیں رہ رہ کے اسی بات پر مکمل یقین ہونے لگا تھا کہ خون کا اثر رنگ لا کے رہتا ہے۔ نیچ ہمیشہ نیچ رہیں گے، ورنہ اس

کی پرورش تو حویلی کی بہو بیٹیوں کی طرح ہوئی تھی، آخر وہ ایسی ذلیل حرکت کر بیٹھی تو کیوں؟ مانا کہ وہ جوان تھی، خوبصورت تھی، لیکن بہر حال وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ دادی کو برابر یہ افسوس ہو رہا تھا کہ ناحق انہوں نے برفتنی کے ساتھ اتنا کچھ کیا، انہیں پہلے ہی غور کر لینا چاہئے تھا کہ کمبخت کی نسل کیا ہے؟ اس کی رگوں میں خون کس کا ہے؟ دادی خون اور نسل کی اہمیت سے پہلے ہی واقف تھیں لیکن اب تو وہ اس بات پر ایمان لا چکی تھیں۔ اور حقیقت حال بھی کچھ یہی تھی۔ مقابلے کے لئے ان کے سامنے اُستانی جی ہی تھیں۔ ابھی ان کا سن ہی کیا تھا۔ لمحہ لمحہ جوڑ لیا جاتا تو مشکل سے ان کی عمر چھبیس، ستائیس سال کی تھی۔ آج پانچ برس ہوئے کہ ان کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں، بس اتنے ہی دنوں تو ان کی مانگ کا سیندور قائم رہا تھا۔ نفیس صدیقی اچانک قلب کی حرکت بند ہونے کے باعث اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور تب سے بڑی سنجیدگی سے مہ جبیں بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ لٹھے کی سفید شلوار، بگلے کی طرح بے داغ اجلے جمپر اور دودھ کی طرح اُجلی ململ کی اوڑھنی میں ملبوس بس وہ حویلی کی لڑکیوں کو پڑھانے میں اپنا وقت صرف کرتی تھیں، ویسے ان کا جسم کچھ کم گدرایا ہوا تو نہ تھا۔ برفتنی کے مقابلے میں ان کا ناک نقشہ کچھ زیادہ ہی متناسب تھا۔ اس پر جوانی کی گرفت بڑی ہی زبردست تھی۔ ان کی چال میں بلا کی تمکنت اور ان کی چھب میں غضب کا وقار تھا۔ اس پر طرّہ ان کا قیامت کا رنگ تھا جیسے جلد کی رنگت نہ ہو کندن پر کا پگھلا ہوا سونا ہو۔ لیکن یہ سب مقفّل، بالکل مقفّل۔ رنگ روپ کا یہ عالم، پر سنجیدگی کا حال یہ کہ اتنی سی عمر میں بڑی بوڑھیوں جیسے تیور۔ یہی وجہ تھی کہ مہ جبیں کا وجود ختم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ اُستانی جی نے لے لی تھی۔

دادی سوچتیں کہ اسی کو واقعی شرافت کہتے ہیں، ہزار غربت سہی، محرومی سہی لیکن کیا مجال کہ کوئی قدم اِدھر اُدھر پڑ جائے۔ یہ دراصل خون اور نسل کی شرافت ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے عورتوں کی ایک بڑی تعداد حویلی میں جمع ہو گئی اور سب نے اپنے اپنے تاثرات کا بڑے دُکھ کے ساتھ اظہار کیا۔ امّاں اور دادی نے برفتنی کی سات پشتوں کو کھنگال کر رکھ دیا اور ہر بار تذکرہ اُستانی جی کی شرافت اور امتیاز پر آ کر ختم ہو جاتا۔

اُستانی جی کا حویلی سے دور کا رشتہ تھا۔ لیکن جب سے یہ بیوہ ہوئی تھیں حویلی کی چہار دیواری میں آ کر بند ہو گئی تھیں۔ دن بھر کے اوقات ان کے بٹے ہوئے تھے۔ نماز، تلاوت اور لڑکیوں کو درس دینے میں صبح سے شام ہو جاتی تھی، ان کی زندگی ایکدم صاف ستھری تھی۔ حقیقت میں اُستانی جی ایک ایسا چاند تھیں جس میں کوئی داغ نہ تھا۔ اب برفتنی سے ان کا مقابلہ ہی کیا تھا، وہ

تو مماثلت کی صورت صرف دونوں کی بیوگی سے پیدا ہوگئی تھی ورنہ کہاں شریف زادی اور کہاں برفتنی جیسی رذیل عورت!

برفتنی کے فرار سے اُستانی جی کو بھی متلی آ رہی تھی اور وہ رہ رہ کے اس کا اظہار کر رہی تھیں کہ اس کا چال چلن تو بہت پہلے سے ان کے آگے مشکوک تھا لیکن منہ کی بات اور کمان کا تیر ایک بار نکل جانے کے بعد واپس نہیں آسکتے، بس اسی باعث وہ خاموش تھیں۔

سو ایسے ہی تذکرے میں رات ہوگئی۔

امّاں تو نو بجے ہی کھا پی کر سو گئیں۔ لیکن دادی جب کھانے پر بیٹھیں تو ان کا جی بھاری بھاری سا لگا اور ان سے کچھ کھایا پیا نہ گیا اور وہ اٹھ کے بستر پر دراز ہوگئیں، لیکن نیند تھی کہ کوہ قاف میں بس گئی تھی۔ رَہ رَہ کے انہیں برفتنی کے کرتوت یاد آ رہے تھے، وہ اپنے ذہن کو کوشش کے بعد بھی جھٹک نہ سکیں اور کروٹ بدلتے بدلتے آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوگئی۔

معاً انہوں نے لیٹے ہی لیٹے دیکھا کہ حمید بھائی اپنے کمرہ سے نکل کر آنگن میں آ گئے ہیں، کچھ وقفے کے بعد ان کے قدم اُستانی جی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اُستانی جی کے کمرہ میں لالٹین کی روشنی تیز ہوگئی۔ دادی کا دِل بڑے زور سے دھڑکنے لگا، وہ دبے قدموں اُستانی جی کے کمرے تک آئیں اور کھڑکی سے جھانک کے کچھ دیکھا، انہیں اپنی نظروں پر یقین نہیں ہو رہا تھا، ان کے منہ سے بس اتنا نکلا- ''چھی چھی، توبہ توبہ''۔ دادی کے قدموں میں منوں گیلی مٹی لگ گئی اور وہ بڑی مشکل سے اپنے بستر پر واپس آئیں۔

(مطبوعہ: ''شاعر''، بمبئی، نومبر ۱۹۶۲ء)

گردش میں ہے آسماں

آج ۳۹۵۷ گردش کا یکم نہار تھا۔ مشتری روزانہ ساعت کی پہلی خبر پڑھتے ہی چونک گئی۔ خبر واقعی غیر معمولی تھی۔ ملک شفق کے ایک ماہر لسانیات نے 'ساعت' کے ایک نمائندے سے انکشاف کیا تھا کہ دو ہزار گردش پہلے کی ایک کتاب اس کے ہاتھ لگی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں دنیا نامی عجیب وغریب جگہ تھی جہاں کے لوگ لیل ونہار کے درمیان تین چار بار خاصی مقدار میں کھانا کھاتے تھے۔ وہ زمین کھودتے تھے اور کھانا پیدا کرتے۔ وہ اپنے جسم کو کپڑا نام کی کسی شے سے ڈھکتے تھے۔ پاؤں سے چلتے تھے اور تین سو میل یا زیادہ کی مسافت اگر طے کرنا ہوتی تھی تو ٹرین نامی سواری پر چڑھتے تھے اور پورے لیل ونہار یا زیادہ چڑھے رہتے تھے۔ ماہر لسانیات نے مزید سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ دنیا کی آبادی میں اکثر مرد عورتوں کا چلن یہ تھا کہ کوئی ایک مرد کسی ایک عورت کے ساتھ زندگی بھر رشتہ رکھتا تھا جو میاں بیوی کہلاتے تھے اور تقریباً نصف گردش جنسی اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے مقید رکھتے تھے۔ ان کا قد عام طور سے ساڑھے چار فٹ سے ساڑھے پانچ فٹ کے درمیان ہوتا تھا۔

مشتری نے یہ خبر ختم کی تو ایک چیونٹی سی اس کے ڈھائی فٹ کے صحت مند جسم پر رینگ گئی، اسے یاد آیا کہ اس کی صحبت کی عمر میں گردش پہلے ہوئی تھی۔ تب سے اب تک بارہ مرد اس کے کنٹریکٹ میں آچکے ہیں۔ ایک چوتھائی گردش تک بھی کوئی کام کا باقی نہیں رہتا ہے۔ حالانکہ اتنی مدت میں اسے کئی بار انرجی کا انجکشن بھی لگا دیا جاتا ہے۔ اچانک مشتری کے ذہن میں ۱۹۵۷ گردش کے مرد کا ایک تصور ابھرا۔ اختراع کے دیو قامت پانچ فٹ کے مردانہ پیکر سے وہ سہم گئی۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے آپ میں واپس آئی اور از سر نو خبر کا سنجیدگی سے تجزیہ کرنے لگی۔ اسے ۱۹۵۷ گردش کی دنیا اور اپنے ملک چاند میں کوئی مماثلت نظر نہ آئی۔ مشتری نے سوچا کہ دنیا والے بڑے غیر مہذب اور وحشی لوگ تھے۔ واقعی دنیا ایک ڈارک جگہ تھی جہاں کلچر نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بھلا لیل ونہار کے درمیان تین چار بار حلق سے کچھ نیچے اتارنے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔ پاؤں

سے چلا کیسے جا سکتا ہے۔ کھانا پیدا کرنا کیا ہوا؟ یہ کپڑا کیا لعنت تھی؟ دو ڈھائی سو میل کے سفر کے لئے لیل و نہار کا عرصہ! توبہ کیسی سواری تھی وہ؟

مشتری کا ذہن ایسے ہی کتنے سوالات سے بھر گیا اور آخرش وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ ماہر لسانیات نے ایک شوشہ چھوڑا ہے جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن ملک شفق میں افواہوں کا گذر نہ تھا کہ یہ دنیا بڑی عملی تھی، اس لئے مشتری کے ذہن میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ یکا یک اس نے سوچا کہ قمر ہوتی تو اس سے تبادلہ خیال کر لیا جاتا۔ لیکن دو منٹوں پہلے وہ ملک زحل کی ایک غیر معمولی نمائش میں گئی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی میں ۲۰ منٹ کی دیر تھی، مشتری کو بڑی الجھن ہوئی۔ زحل اور چاند میں محض دو ہزار میل کی دوری ہے لیکن اپنی مجبوری کا عالم یہ ہے کہ پورے دس منٹ آمد و رفت میں لگ جاتے ہیں۔ مشتری کو بڑی شدت سے یہ احساس ہوا کہ ابھی تک ہم چاند والے سواری اور وقت کے مسئلہ پر قابو نہیں پا سکے ہیں۔ سائنس نے بے شک ترقی کی ہے لیکن ترقی کی رفتار بے حد مایوس کن ہے۔ اس خیال کے آتے ہی دنیا کی ٹرین کا انکشاف اس کے ذہن کے پردے پر آ گیا۔ اور اس نے برا سا منہ بنا کر بڑی حقارت سے تھوک دیا۔ ٹھیک اسی وقت مشتری کی آیا مہتاب سامنے آئی اور اس نے کچھ یاد دلانے کی اجازت چاہی۔ مشتری نے اثبات میں سر کو ایک جنبش دی۔

چاند کی ملکہ! آج آپ کے کھانے کا نہار ہے"۔ مہتاب نے بڑے ادب سے کہا۔

"کیا آج چار گردشیں یعنی ۱۴۸۰ نہار پورے ہو گئے"۔ مشتری نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں! خوراک کی ٹکیہ حاضر ہے"۔ اور مشتری نے پانی کے سہارے خوراک کی ٹکیہ حلق سے نیچے اتاری۔ ٹکیہ کھاتے ہی اس کا منہ کڑوا ہو گیا اور وہ مہتاب سے تلخ لہجے میں بولی:

"مہتاب! مجھے تو بھوک ابھی بالکل نہ تھی، یہ بڑی جہالت ہے کہ محض چار گردشوں کے بعد ہم کھایا کریں اور وقت برباد کریں۔ ہمارے سائنس داں تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ساری زندگی کی خوراک کے لئے کوئی ایک ٹکیہ ایجاد کر لی جائے۔ معاً مشتری کے ذہن میں شفق کے ماہر لسانیات کا وہ انکشاف یاد آ گیا کہ اہل دنیا لیل و نہار کے درمیان تین چار بار خاصی مقدار میں کھاتے تھے اور وہ ایک بار پھر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی، یہ انکشاف اگر حقیقت ہے تو پھر دنیا والے پھوہڑ اور ناقص لوگ تھے۔ اتنے میں مہتاب پھر حاضر ہوئی اور اس نے خبر دی کہ قمر آ گئی ہے۔ مشتری نے ریلیف سا محسوس کیا اور قمر کے پاس چلی آئی۔

"نمائش کیا تھی وقت کی بربادی تھی"۔ قمر نے چھوٹتے ہی زحل کی نمائش پر تنقید کر دی۔

''آخر کیا دیکھا تم نے وہاں؟'' مشتری نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''کچھ قدیم کتابیں، کچھ پرانے پتھر، کچھ خرافات''۔ قمر نے جواب دیا۔

''یعنی''؟ مشتری کو تجسس ہوا۔

''میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ گائڈ نے بتایا کہ کبھی اور کسی زمانے میں خدا، بھگوان، گاڈ اور اسی طرح کے کچھ الفاظ میں ایک مطلق العنان طاقت کا تصور تھا''۔ قمر سانس لینے کو آئی۔

''میں سمجھی نہیں''۔ مشتری کو الجھن ہوئی۔

''کسی گردش میں دنیا کے لوگ اسی تصور کے سہارے جیتے مرتے تھے۔ یعنی اس مطلق العنان نے چاہا تو ہم مر گئے، جی گئے، ہم فقیر ہو گئے، ہمیں امارت مل گئی۔ یہاں تک کہ ہمارے رونے ہنسنے، چلنے پھرنے، مختصر کہ ہمارے ہر عمل میں اسی کی خواہش کا دخل تھا۔ اس طرح ہم کچھ نہ تھے''۔ قمر نے ایک ہی سانس میں وضاحت کر دی۔

''تو وہ مطلق العنان رہتا بستا کہاں تھا''؟ مشتری نے طنز سے پوچھا۔

''لوگوں کے ذہن میں''۔ قمر کے اس بے ساختہ جواب سے مشتری کو ہنسی آ گئی، ہنستے ہی ہنستے اس نے قمر سے کہا:

''آج کا نہار ہم دونوں ہی کے لئے برا ثابت ہوا۔ تم زحل جا کر بور ہوئی اور میں 'ساعت' پڑھ کر مکدر ہوئی''۔

''ساعت میں کیا ہے؟'' قمر نے پوچھا۔

''شفق کے کسی ماہر لسانیات کے اوٹ پٹانگ انکشافات ہیں''۔ مشتری نے بے دلی سے جواب دیا۔

''کیسے انکشافات؟'' قمر نے تفصیل چاہی۔

''یہی کہ ۱۹۵۷ گردش میں دنیا نامی کوئی جگہ تھی، جہاں کے لوگ پاؤں سے چلتے تھے، ٹرین سے سفر کرتے تھے، جو دو تین سو میل کی مسافت پورے لیل و نہار میں طے کرتی تھی''۔ مشتری سانس لینے کو آئی۔

''بس اتنی ہی کچھ باتیں تھیں۔ قمر نے بڑی دلچسپی ظاہر کی۔

''اور بکواس بھی تھی۔ مثلاً یہ کہ لیل و نہار کے درمیان اہل دنیا تین چار بار خاصی مقدار میں کھاتے تھے۔ ان کا قد پانچ فٹ کا ہوتا تھا''۔ مشتری نے آخری فقرہ زور دے کر ادا کیے۔

''پانچ فٹ کا قد!'' قمر نے حیرت ظاہر کی۔

''اور سنو، وہاں کی اکثر عورتیں اور مرد کسی ایک انتخاب سے زندگی بھر رشتہ رکھتے تھے اور جو تقریباً نصف گردش تک جنسی اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے باصلاحیت رہتے تھے''۔ ابھی مشتری اتنا ہی کچھ کہہ پائی تھی کہ قمر کا اٹھارہواں مرد عطارد جو دو فٹ کا تھا، ہاتھ میں رقعہ لئے سامنے آ گیا۔ قمر نے عطارد کو دیکھتے ہی بڑی لگاوٹ سے کہا ''کیا بات ہے پیارے؟'' عطارد کی تیوری پر بل پڑ گئے اور اس نے بڑے ناگوار انداز میں رقعہ سامنے کر دیا۔

قمر نے زیر لب پڑھا— ''میں پورے ساٹھ لیل ونہار آپ کی جنسی خدمت انجام دیتا رہا، میں اب قطعی بے کار ہوں، افسوس ہے کہ بیس لیل ونہار کی مزید مدت جو کنٹریکٹ میں شامل ہے مجھ سے پوری نہیں ہو سکے گی''۔ قمر نے رقعہ ختم کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہا ''انجکشن لگا کے دیکھا ہوتا''۔

''وہ تو کر چکا!'' عطارد اتنا کہہ کر غائب ہو گیا۔

مشتری نے قمر کے ہاتھوں سے رقعہ لے لیا اور ایک بار خود پڑھا۔ اچانک تشویش کی لکیریں اس کی پیشانی پر ابھر آئیں۔ اس کا بارہواں کنٹریکٹ دو چار نہار ہی میں ختم ہونے والا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اتنے میں قمر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''کیا دنیا کے مرد عورتوں کی جنسی طاقت وہی کچھ تھی جو شفق کے ماہر لسانیات نے بتایا ہے؟'' قمر کے اس سوال سے ۱۹۵۷ گردش کا مردانہ پیکر مشتری کے ذہن میں داخل ہو گیا، اس کے جسم میں ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ بہ مشکل اتنا کہہ سکی ''ہو سکتا ہے انکشافات سچے ہی ہوں''۔ اتنا سنتے ہی قمر بول پڑی ''مجھے ۱۹۵۷ گردش کی دنیا زیادہ مکمل اور پر کشش نظر آتی ہے''۔ یکا یک مشتری کو یہ احساس ہوا کہ ذہن کے کسی سطح پر وہ بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی ہے۔ اور اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا:

''میں تو زحل کے عجائب خانہ والے خدا کو بھی مان لوں اگر مجھے پانچ فٹ کا کوئی مرد مل جائے جو مجھ سے ساری زندگی رشتہ رکھے''۔

اور قمر نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''سائنس داں سے تو یہ ممکن نہیں، کیا کوئی مطلق العنان ۳۹۵۷ گردش کو ۱۹۵۷ گردش میں بدل نہیں سکتا۔ کیا وقت پیچھے نہیں جا سکتا؟''

مشتری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆　　(مطبوعہ: ماہنامہ ''راوی''، پٹنہ، جنوری ۱۹۶۳ء)

کھویا ہوا چہرہ

میں تو کوئی پروفراک نہیں کہ اپنی زندگی کو چائے کی چمچی سے ناپ ڈالوں، لیکن سوال ہے کہ چمچی تو چمچی رہتی ہے کچھ اور نہیں ہو جاتی لیکن یہ زندگی کیا رہتی ہے اور کیا ہو جاتی ہے، اکثر ایک چمچی کے برابر بھی نہیں رہتی، کیا آپ اتفاق کرتے ہیں؟

خیر آپ کے اتفاق کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے، میری زندگی میرے سامنے ہے، دیکھئے یہ ایک چمچی کے برابر بھی نہیں رہی ہے۔ جی ہاں مبالغہ نہیں ہے، میرے ہاں ایک چمچی ہے جو میرے دادا جان کے وقت کی ہے، لیکن اب بھی استعمال ہوتی ہے، چائے میں شکر اسی طرح گھولتی ہے جس طرح (میرا قیاس ہے اور یقینی غلط نہیں ہے، گو کہ میری ہر چیز غلط سی ہو گئی ہے) دادا جان کے وقت گھولتی ہو گی، لیکن میری زندگی!! کیا پوچھا آپ نے کیا تھی اور کیا ہو گئی؟

تو سنئے میں کوئی پروفراک نہیں تھا، بلکہ میں کئی طرح سے ڈان کوئزٹ تھا، بجا فرمایا آپ نے۔ میرا مفہوم خدائی فوج دار ہی قسم کی چیز سے ہے۔ لیکن آپ نے ڈان کوئزٹ کو خدائی فوج دار سے کیوں بدل دیا۔ کیا آپ انگریزی ہٹاؤ دیس بچاؤ تحریک سے وابستہ ہیں؟ بس میں نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ ہاں تو میں اپنی جوانی میں ڈان کوئزٹ تھا۔ ساری دنیا کی اصلاح کا جذبہ تھا میرے اندر، جی ہاں میں ونڈمل سے بھی لڑا ہوں۔ کرم ہے کہ آپ نے ونڈمل کی قومی اصطلاح دریافت نہیں کی۔ تو لڑنے کے بعد میرا بھی وہی حشر ہوا، میں چاروں شانے چت تھا اور ونڈمل چلتا رہا۔ کیا فرمایا آپ نے آپ کو کنایہ پسند نہیں ہے، میری گفتگو آپ نہیں سمجھتے؟ ''پلگرمس پراگرس'' نہ سہی آپ نے ''سب رس'' تو پڑھی ہی ہے، حیرت ہے آپ نے اس سے کیسے لطف لیا ہو گا؟ بہر حال میں نے ایک میرینڈا دیکھی، اس کے لئے میرے جذبات بالکل فرڈی ننڈ جیسے تھے، میں جو اس وقت فرڈی ننڈ تھا، میرینڈا بن گیا۔ اپنے ابا جان کو پراسپرو سمجھتے ہوئے میرینڈا کے بارے میں

کہا: ''اس مندر میں شر کا گذر نہیں ہوسکتا''۔ وہ آگ ہو گئے۔ خیر ہوئی کہ ان کے ہاتھ میں کوئی جادو کا ڈنڈا نہ تھا ورنہ نہ معلوم وہ کیا بنا دیتے۔ بولے کوئی لیلیٰ تلاش کرو، کوئی ساوتری، مجھے میرینڈا نہیں چاہئے (حالانکہ چاہنے نہ چاہنے کا سوال میرا تھا ان کا قطعی نہ تھا) چراغ خانہ چاہئے، شمع انجمن نہیں۔ اس وقت مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں ڈان کوئزٹ ہوتے ہوئے بھی پروفراک ہوں، ورنہ میں نے اپنے ابا جان سے کچھ صاف صاف کہا ہوتا۔ تو ونڈمل چلتا رہا اور میں چاروں شانے چت تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب ہوش ٹھکانے آئے اور میں بدن جھاڑ کر اٹھا تو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی سکڑ سی گئی ہے، ہر چند کہ وہ چمچی کے برابر نہیں ہوئی تھی۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟

میرینڈا سے دور ہونے کے بعد فرڈی ننڈ کی خو کو میں نے تھوک دیا۔ احمق ڈان کوئزٹ، صادق فرڈی ننڈ اب جو تھا تو ڈان جوآں تھا۔ اس تبدیلی کے ساتھ دنیا یکا یک سمٹ کر قدموں میں آ گئی، اتنی لیلائیں، سوہنیاں، ہیلنیں، کلوپٹرائیں اور تنہائیں۔

جی ہاں، میں نے کتنی ہی سیتاؤں کو ہیڈی بنا دیا، مونالیزاؤں میں بدل دیا۔ کیا پوچھا آپ نے، کیا راون کو رام سے مقابل نہیں ہونا پڑا۔ جی ہاں، اکثر رن پڑا ہے۔ لیکن جب رام نے ایک لنکا فتح کیا تو راون کسی دوسرے لنکے میں چلا گیا، پر رام کے علاوہ ایک طاقت اور بھی تھی، اس کا نام وقت ہے، اس نے ڈان جوآں سے، راون سے، ایک ایک ہیڈی، ایک ایک سیتا چھینی اور اب مجھے وہ کئی ناموں سے پکارتا ہے۔

وہ کہتا ہے: ''بھسما سور! رقص کرو گے اس دوشیزہ کے ساتھ، تمہیں اپنا ہاتھ سر پر لے جانے کی شرط نہ ہوگی''۔

وہ پھر کہتا ہے: ''علاء الدین! دیکھو قد آدم شیشہ میں پدمنی کا عکس ہے۔ ادھر اپنا رخ تو کرو''۔

وہ مسکرا کر کہتا ہے: ''جوآں! یہ ایک نئی ہیڈی ہے، دیکھو کتنی معصومیت ہے اس میں، دیکھو، دیکھو اس کا چہرہ، شبنم کا دھلا ہوا ہے، صاف و شفاف، یہ تمہارے لئے ہے''۔

پھر وہ قہقہہ لگاتا ہے اور کہتا ہے: ''راون! یہ سیتا خود اپنے حصار سے تمہاری تلاش میں باہر نکل آئی ہے، اس کے پیچھے کوئی رام نہیں ہے، دیکھو دیکھو اس کی آنکھوں کی سندرتا کو دیکھو، یہ تمہارے لئے ہے''۔

اب میں اس کو کیا جواب دوں، میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ آپ ہی کہئے اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا جواب دیتے؟

آپ نے اپنے منہ پر رومال کیوں رکھ لیا ہے، میرے اردگرد تو ایوننگ ان پیرس کی خوشبو گھومتی تھی، کارواں در کارواں سفر کرتی تھی، اب ساری خوشبو سڑاند میں بدل گئی ہے۔ آپ ہی کیا، وہ میرا بیٹا گاہے ماہے میری خیریت پوچھنے آتا ہے تو چپکے سے رومال اپنی ناک پر رکھ لیتا ہے۔ جی چاہتا ہے اپنا چہرہ بدل لوں، اسے کم از کم دھو ڈالوں، اپنے بستر کی غلاظت کہیں پھینک آؤں، لیکن میں تو اپنے پوتے کے برابر بھی نہیں ہوں جو چار سال پہلے پیدا ہوا ہے اور جو اپنے ننھے ننھے پاؤں سے بھاگ بھاگ کر میرے نزدیک چلا آتا ہے۔ اور میرے بستر کی غلاظت سے غلیظ ہو کر ماں کے ہاتھوں پٹ پٹ جاتا ہے۔ ایسے میں میری خواہش ہوتی ہے کہ میں ایک کروٹ لے سکتا اور معصوم بچے کو پٹنے سے بچاتا۔ تو میں نے جب کہا کہ میں پروفراک بھی نہیں ہوں تو کیا مبالغہ کیا ہے؟

میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں، وہ نٹ کھٹ بچہ کہاں ہے؟ وہ عاشق کہاں ہے؟ وہ ڈان کوئزٹ کہاں ہے؟ وہ ڈان جوآں کہاں ہے؟

آپ جواب کیوں نہیں دیتے، دیکھئے دیکھئے میں اپنا رخ تک نہیں بدل سکتا، نظریں جو چھت میں اٹک گئی ہیں انہیں ہٹا بھی نہیں سکتا، ہل بھی نہیں سکتا۔ یہاں بس میرا بستر ہے، گندگی کا ڈھیر ہے، یہاں تو کوئی بھٹکتا بھی نہیں، موت تک نہیں آتی، کاش کہ میں پروفراک ہی ہوتا۔ ایک چمچی سے اپنی زندگی کو ناپ ہی سکتا! سن رہے ہیں نا آپ!!

(مطبوعہ: ماہنامہ ''شب خون''، الٰہ آباد، اگست ۱۹۶۸ء)

ایک ذرہ، ایک پہاڑ

''زندگی قربانیوں کا نام ہے میرے دوست! پیدا ہونا، جوان ہونا، پھر جوان ہو کر ارد گرد کی سطحی خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا کوئی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو ہر آدمی کرتا ہے اور ہر آدمی ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا''۔ میرے منحنی سے خفیف سے فلسفیانہ ذہن رکھنے والے دوست جمال نے بڑے گمبھیر انداز میں کہا۔ ایسے لوگوں سے سخت کوفت ہوتی ہے جو مرصع قسم کی گفتگو عالمانہ اور مفکرانہ لب ولہجہ میں کرتے ہیں۔ یہ کوفت اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی اپنا ہی دوست اتنا تصنع برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے جمال کی گفتگو بے حد خشک اور بے موقع معلوم ہوئی اور میں نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا ''میں جانتا ہوں جمال کہ بدقسمتی سے تم نے بی اے میں فلسفہ لے رکھا تھا۔ لیکن اس مضمون نے تمہیں کہیں کا نہیں رکھا اور تم ایک عجوبے سے آدمی ہو کر رہ گئے۔ بھلا قربانی اور زندگی میں کیا تعلق ہے؟ کیا کسی قربانی کے بغیر زندگی نامکمل رہتی ہے؟ کیا امیر و کبیر افراد جن کے ارد گرد خوشیاں محو رقص رہتی ہیں وہ سطحی زندگی گذارتے ہیں؟ مجھے سخت الجھن ہوئی کہ جمال نے میری باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اس کی تیوری پر کوئی بل نہیں پڑا۔ وہ بالکل نارمل رہا۔ پھر بولا ''مجھے ذاتیات پر حملہ کرنا نہیں آتا لیکن دو چار باتیں تمہیں کہنی ہیں۔ ہو سکتا ہے تم مجھ سے رنج ہو جاؤ۔ الگ ہو جاؤ۔ یا پاگل فلسفی سمجھ کر معاف کر دو''۔ جمال سانس لینے کے لئے رکا اور میں نے تیر پھینکا۔ ''اب کہو بھی تمہیں کیا کہنا ہے، وہی نصیحتوں کے گل بوٹے ہوں گے۔ مثالی زندگی کی مفلسی کی عظمت پر تقریر ہوگی''۔

''رونق تم نہیں جانتے کہ حقیقی اور سچی خوشی کسے کہتے ہیں۔ دراصل تمہارا ماحول ہی کچھ ایسا رہا ہے۔ تم تو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے۔ نوکروں کی بھیڑ چال میں رہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ وقت کی پکار کیا ہوتی ہے۔ اس پکار پر لبیک کہنا کیا ہوتا ہے۔ ذرا زندگی کی گہرائیوں

میں جھانکو تو، اس کی تہوں کا مطالعہ تو کرو۔ اپنے محل کی چہار دیواری سے نکلو تو۔ تم تو شہزادے ہو شہزادے۔ تمہیں زندگی کی قدروں کا حال کیا معلوم"۔

مجھے جمال کی گفتگو عجیب وغریب معلوم ہوئی۔ میں واقعی مکدر ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جمال کی آنکھوں میں میری دولت گڑتی ہے اور وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ اسی احساس کمتری کے باعث ایسی جلی کٹی سناتا ہے مجھے۔ اور میں نے قدرے الجھتے ہوئے کہا "میاں جمال تم میرے دوست ہو، میں تمہیں اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیکن تمہاری گفتگو کا یہ تیور خطرناک حد تک نامناسب ہے۔ آخر میری دولت تمہیں اتنی کڑوی کیوں لگتی ہے۔ کب میں نے اپنی عظمت تم پر جتانے کی کوشش کی۔ کب میں نے یہ جانا کہ میں تم سے کسی طرح برتر ہوں"۔ جمال بھی جیسے لڑنے کے موڈ میں تھا، بولا "میں کوئی سطحی آدمی نہیں کہ تمہاری دولت کے بارے میں سوچوں بھی (کوئی مارکسی نقطہ نظر کا حامل نہیں کہ دولت کی مساوی تقسیم ہی کو سارے مسائل کا حل سمجھوں) لیکن ایک ایسا عام آدمی ضرور ہوں جو جانتا ہے کہ ذاتی خوشیوں کی حدیں بہت مختصر ہوتی ہیں، سکڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ کسی کی خدمت کر دینا، کسی کی مدد کر دینا، کسی کو آرام پہنچا دینا، کسی کا سہارا بن جانا، زندگی اور حقیقی زندگی کے چند کھلے مطالبے ہیں۔ ان پر ہر شخص کو غور کرنا چاہئے اور اپنی بساط بھر ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی۔ تمام مذاہب کی بنیاد بھی ایسے ہی چند واضح اصولوں پر ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو ہی مرکز خیال سمجھے تو پھر یہ تو پرلے درجے کی خود غرضی ہوئی۔ اب کے جمال کی چند باتیں میرے دل کو لگیں لیکن میں تو محل اور شہزادے والی باتوں سے چڑ گیا۔ بولا "رونق تم ہی بتاؤ اس دنیا میں کون حاجت مند نہیں ہے۔ بقول شخصے کس کی حاجت روا کرے کوئی۔ تم تو اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتے ہو۔ دوست میرے اپنی فکر کرو، کہاں سارے جہاں کا درد اپنے سینے میں سمیٹے پھرتے ہو۔ میں تو کہتا ہوں کوئی ایسی سبیل نکالو کہ تم بھی محلوں کے راجہ بن جاؤ۔ شہزادے بن کر اتراؤ۔ زندگی کی تہوں میں جھانکنے کا حاصل ہی کیا ہے۔ اس کی قدروں کو سمجھنے میں کیا رکھا ہے۔ دوست میرے آؤ آج میرے ساتھ عہد کرو کہ اپنی مفلسی کا لبادہ اتار پھینکو گے، دنیا میں جینے کے حقدار بنو گے۔ اپنے کو مالی اعتبار سے ٹھوس بنانے کی کوشش کرو گے۔ چاہے اس کے لئے غلط راستے ہی کیوں نہ اپنانے پڑیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ جمال میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بجائے قہقہے لگانے لگا۔ بڑے زوروں کے قہقہے، اس طرح میں ایک بار پھر غصہ میں آ گیا اور بولا "میرے منحنی سے دوست اتنے زور سے نہ ہنسو کہ تمہارا پھیپھڑا پھٹ کر تمہارے منہ

میں آ جائے۔ مجھے واقعی بعض اوقات تم سے بڑی ہمدردی ہوئی ہے۔ تم کو تو بس اللہ نے ایک بڑا سر دیا ہے جس میں بھُس ہی بھُس ہے۔ پیٹ تو خالی ہے ہی اور دماغ میں خشکی ہی خشکی ہے''۔

میں نے محسوس کیا کہ جمال ایکدم سے سنجیدہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا، اور بڑے المناک انداز میں بولا'' ایسا لگتا ہے کہ تمہاری ہماری پٹری کبھی نہیں بیٹھے گی۔ میں سمجھا تھا کہ یتیموں کے لئے تمہاری مدد سے ایک ہائی فری اسکول کھل جائے گا لیکن شاید ابھی قدرت کو یہ منظور نہیں ہے۔ اسکول تو کھل ہی جائے گا لیکن اس میں اب کچھ دیر ہو جائے گی۔ خیر میری باتوں کا برا نہ ماننا، میں چلا۔ ضرورت محسوس کی تو پھر ملوں گا''۔ قبل اس کے میں جمال سے مجوزہ اسکول کے لئے کسی رقم کی پیشکش کرتا وہ تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا اور میں سوچنے لگا، عجیب پاگل آدمی ہے۔ بالکل پاگل ہے۔ دنیا بھر کی فکر لئے بیٹھا ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی قومی پروگرام لئے بیٹھا ہے۔ اور اپنے لئے کوئی بھی پروگرام نہیں۔ خود تعمیری کے لئے کوئی جدوجہد نہیں۔ اٹھائیس سال کا جوان اور ایسے تیور۔

مجھے یاد آیا کہ گذشتہ ماہ وہ مجھے سیٹھ دھرم داس کے یہاں لے گیا تھا۔ ودھوا آشرم کھولنے کی ایک اسکیم مرتب کی تھی۔ پانچ دس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ سیٹھ دھرم داس نے اسے شربت پر ٹرخا دیا تھا۔ مانا کہ سیٹھ کے پاس لاکھوں لاکھ کی دولت ہے لیکن کیا یہ دولت مفلس، غریبوں اور قلاشوں میں بانٹ دینے کے لئے ہے۔ سیٹھ دھرم داس بھی کیا زمانہ شناس آدمی ہے۔ اتنے تپاک سے ملا کہ میں سمجھ بیٹھا کہ جمال کی اسکیم کامیاب ہوئی۔ ودھوا آشرم اب کھل جائے گا۔ لیکن باتیں باتیں ہی تک محدود رہیں۔ سیٹھ نے یہ کہہ کر جمال کو مطمئن کر دیا تھا کہ وہ برسوں سے اپنے طور پر ہی یہ کام کر دینے کی سوچ رہا ہے اس لئے جمال کو مطمئن رہنا چاہئے۔

پھر مجھے خیال آیا کہ کچھ دنوں پہلے دو چار ہزار روپے کتنی محنت و مشقت سے عوام سے لے کر جمع کئے اور اپنے محلے کے غریب بچوں کے لئے مفت دودھ تقسیم کرنے کا ایک ادارہ قائم کیا اور یہ ادارہ اب تک اپنے کام انجام دے رہا ہے۔

یکا یک جمال کے لئے میرے دل میں ہمدردی کی کئی لہریں اٹھیں۔ میں اسے عرصہ سے جانتا تھا۔ اسکول اور کالج کے دنوں میرا اس کا ساتھ رہا تھا۔ مجھے کئی ایک واقعے یکے بعد دیگرے یاد آ گئے۔ نتائج کے اعتبار سے اس کا نام تو سرفہرست رہتا ہی تھا، لیکن ایک مرتبہ آئی. اے کا امتحان صرف اس لئے نہیں دے سکا کہ یونیورسٹی فیس کے لئے جو روپے تھے وہ ایک دوست کی بیماری

میں لگا دیئے تھے۔ ایک سال بی.اے میں ایک مضمون میں صرف اس لئے نہیں بیٹھا کہ پڑوس کا ایک غریب آدمی اسی دن مر گیا تھا۔ جس کے کفن دفن کے لئے روپیوں کے انتظام میں لگ گیا تھا اور اب جب کسی طرح بی.اے ہو گیا ہے تو سارے زمانے کی مشکلات کے لئے سینہ سپر ہو گیا ہے۔ دودھ مفت بانٹتا ہے تو اسے غریب بچوں کے لئے مدرسے کھولنے ہیں تو اسے (وِدھوا آشرم کی اسکیم ہے تو اس کے پاس)، یتیموں کے لئے ہائی اسکول کے انتظامات کرنے ہیں تو.....

یکا یک میرے ذہن کے پردے پر اس کے الفاظ آ گئے ''زندگی قربانیوں کا نام ہے۔ میرے دوست پیدا ہونا، جوان ہونا، پھر جوان ہو کر ارد گرد کی سطحی خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا کوئی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو ہر آدمی کرتا ہے۔ اور ہر آدمی ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے''۔ میں نے سوچا کہ کیا جمال اپنی کارگذاریوں کے بل بوتے ہمیشہ زندہ رہ سکے گا۔ میرے دل میں اسی سلسلہ میں جنگ ہو رہی تھی کہ مجھے اس کی بیوی بچے یاد آ گئے۔ جمال اپنے طور پر تو سادہ تھا ہی لیکن اس کی بیوی اور بچوں کی زندگی کتنی بے ضابطہ تھی۔ گھر کی مستقل آمدنی تو کچھ تھی نہیں۔ مکان برسات میں ٹپکنے کی حد تک کمزور اور خطرناک۔ تین بچے جن کی زندگی کے لئے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تھا۔ جمال نے اب تک ان کے مستقبل کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جمال ایک پڑھا لکھا سادھو ہے۔ وہ اس زمانہ کا آدمی نہیں ہے۔ ورنہ قومی خدمت کرنے والے تو اپنے گھر کو پہلے بھرتے ہیں۔ لیکن اس کے اپنے بندھے ٹکے اصول نے اسے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ وہ تو دوسروں کے لئے زندہ تھا اور دوسروں کے لئے مرتا تھا۔ ایسے دوست کے لئے ہمدردی کے ساتھ ساتھ نفرت کے جذبات بھی اٹھتے ہیں۔ اور یہی حال میرے دل کا تھا۔ کمبخت اپنی زندگی سنوار لیتا تو مجھے کوئی الجھن نہیں ہوتی لیکن اس کے خود ساختہ ضابطہ نے تو اس کی اچھی خاصی ذہانت کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ عرصہ تک میری ملاقات جمال سے نہیں ہوئی۔ مجھے رہ رہ کے یہ خیال ہو رہا تھا کہ جمال مجھ سے خفا ہے اور خفگی کی بات بھی تھی۔ میں نے گذشتہ ملاقات میں کیا کچھ نہ کہہ دیا تھا اسے۔ واقعی یہ کتنی سخت بات ہوئی جو میں نے کہہ دیا کہ وہ میری دولت سے جلتا ہے۔ احساس کمتری کا شکار ہے۔ اس لئے ہی مجھے جلی کٹی سناتا ہے۔ رہ رہ کے مجھے پچھلی باتوں کا خیال آ رہا تھا اور مجھے بڑی ندامت ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ میں نے اپنے گاندھی وادی دوست کو ناخوش کر دیا۔ میرے پاس انبوہ پیسے ہیں۔ آخر اس نے مجھے دوست سمجھا تب ہی تو یتیموں کے اسکول کی تجویز لے کر میرے سامنے آیا تھا۔ پھر

میں نے ارادہ کیا کہ میں خود اس کے پاس جاؤں گا اور اس سے معافی مانگ لوں گا۔ اسکول کے لئے ایک بڑی رقم اس کے حوالے کر دوں گا۔

ایسے ارادے تو کئی بار ہوئے لیکن میں جمال کے یہاں نہ جا سکا۔ کیونکہ کاروباری مصروفیتیں ادھر بہت بڑھ گئی تھیں۔

لیکن میں اس دن یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ جمال مجھ سے واقعی رنج ہے اور بے حد رنج ہے۔ ادھر چینیوں نے ہماری سرحد پر حملہ کر دیا تھا۔ پورے ملک میں انتشار کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ملک کے جوان سینہ سپر ہو گئے تھے اور اپنے ملک کی عظمت کے لئے قربان ہونے کے لئے ہر وقت تیار بیٹھے تھے۔ ایسے میں مجھے جمال بے حد یاد آ رہا تھا۔ اس کے جملے یاد آ رہے تھے۔ ''رونق تم نہیں جانتے کہ حقیقی اور سچی خوشی کسے کہتے ہیں۔ دراصل تمہارا ماحول ہی کچھ ایسا رہا ہے۔ تم تو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے۔ نوکروں کی بھیڑ چال میں رہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ وقت کی پکار کیا ہوتی ہے۔ اس پکار پر لبیک کہنا کیا ہوتا ہے''۔ اور مجھے ایسا لگا کہ وقت مجھے پکار رہا ہے اور مجھے لبیک کہنا ہے کیوں کہ زندگی قربانیوں کا نام ہے اور واقعی یہ قربانی ایسی ہو گی جس سے زندگی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ لیکن جمال اب کے میرے پاس نہیں آیا تھا۔ اسے آنا چاہئے تھا۔ مجھے ہر لمحہ اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ آ کے مجھے روشنی دے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میری دولت کا اس وقت صحیح مصرف کیا ہے۔ لیکن جمال میرے پاس نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ شاید وہ مجھ سے رنج تھا۔ اور اسے رنج ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ میں نے بڑی سطحیت اس کے ساتھ دکھائی تھی۔ اپنی برتری کا سکہ جمایا تھا اور تب میرے قدم جمال کے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ میرا ذہن بھاری ہو گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ چین کا ہندوستان پر حملہ کیا معنی (ہم ہندوستانی تو گاندھی وادی لوگ ہیں) ہم اہنسا کے پرستار ہیں۔ ہم پنچ شیل کے علمبردار ہیں۔ ہم تو جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ کیسی بربریت ہے کہ چین یہ سب کچھ خاطر میں نہ لایا اور ہمارے علاقے پر حملہ آور ہوا۔ میں ایسے ہی غور و فکر میں غلطاں جمال کے مکان کے دروازے کے پاس آ گیا اور بغیر اطلاع دیئے آنگن میں چلا آیا کہ جمال کی بیوی سے میرا کوئی پردہ نہ تھا۔ ہم تو بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک دوسرے کی بیوی کو جانتے پہچانتے تھے۔ میں ابھی کمرے میں داخل ہونے والا ہی تھا کہ میرے کانوں سے ایک نحیف آواز ٹکرا گئی — ''پپو کا بخار آج بڑھ گیا ہے۔ آج بھی دوا نہیں ہے۔ ایک سو دو سے ایک سو تین ٹمپریچر ہو گیا''۔ میں نے پہچانا کہ یہ آواز مہہ جبیں کی ہے۔

مہہ جبیں جس کے حصے میں جمال جیسا شوہر آیا تھا۔ ''ہاں... ہاں میں ڈاکٹر کو لے آؤں گا۔ گھبراؤ نہیں بخار اتر جائے گا''۔

''میری مانو تو میں ایک بات کہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یہ جو انگوٹھی رہ گئی ہے.....جی ہاں.....انگوٹھی.....''۔

ٹھیک کہتی ہو مہہ جبیں۔ لیکن پپو کا بخار تو اتر ہی جائے گا۔ یہ انگوٹھی تو۔

ہاں جانتی ہو کم بختوں نے آج مجھے پھر رد کر دیا کہ میں پست قد ہوں، نحیف ہوں، کمزور ہوں، میں جنگ کے لئے مناسب نہیں۔ بھلا بتاؤ تو پہاڑ کو لوگ ذرہ سمجھتے ہیں (میرا عزم نہیں دیکھتے لوگ، جسم دیکھتے ہیں)۔ ہاں تو پپو کے لئے دوا آ جائے گی.....یہ انگوٹھی.....''۔

''جی ہاں، یہ انگوٹھی لے جایئے۔ بخار بڑھ رہا ہے۔ دوا آنی بہت ضروری ہے''۔

''پپو کا بخار خود ٹھیک ہو جائے گا مہہ جبیں، خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور یہ انگوٹھی..... یہ انگوٹھی.....قومی دفاعی فنڈ میں دے دو''۔

''ملک کو سونے کی ضرورت ہے۔ پپو کی دوا سے زیادہ''۔

میں جیسے جامد ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

آبگینۂ تندیٔ صہبا

ریٹائرڈ پروفیسر جمال احمد آخرش مجھ سے تنگ آ گئے۔ بولے— ''بھئی میں نے دوبارہ شادی نہیں کی اس کی کئی وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ شادی صرف ایک بار اور صرف ایک ہی عورت سے ہوسکتی ہے۔ دوم یہ کہ مجھے یقین ہے کہ شاہدہ جیسی مکمل عورت مجھے نہیں ملتی''۔ اتنا کہہ کے وہ بالکل کملا سے گئے، خاموش ہو گئے۔ مجھے کریدسی ہوئی اور میں نے شاہدہ مرحومہ کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے پوچھا، ''بڑی محبت تھی آپ کو ان سے یقینی، وہ بہت سی صفات کی عورت ہوں گی!'' اچانک پروفیسر جمال کی آنکھیں چمکنے لگیں، جیسے کئی دلکش تصویریں ان کی آنکھوں کے سامنے آ گئی ہوں۔ پھر وہ بولے اور بولتے ہی رہے، جیسے ان کا کوئی مخاطب ہی نہ ہو۔

ہاتھ کی لکیروں کی باتیں تھیں، ایسی جن پر مجھے کوئی بھروسہ نہیں۔ میں نے شاہدہ سے کہہ دیا تھا، ''چھوٹی انگلی کے ماؤنٹ کا مبہم چھوٹا خط یہ ظاہر کر رہا ہے کہ میری ازدواجی زندگی ناکامیاب ہے''۔ شاہدہ زچ ہوگئی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس کا چہرہ زیادہ سرخ ہو گیا تھا۔ کچھ زیادہ حسین، اور وہ عجب انداز سے بولی تھی، ''اب آپ قسمت کو کیا کیجئے گا، مجھ ہی میں کوئی کیڑا نکلے گا۔ آپ تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں''۔ مجھے شاہدہ کا طنز اور میٹھا میٹھا پیارا پیارا غصہ بڑا پسند آیا تھا۔ چاہا کہ کچھ اور دق کروں۔ اس لئے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا ''اور لطف تو یہ ہے کہ اس ماؤنٹ پر خط کی بجائے خطوط ہیں۔ پہلا خط پھیکا سا، مٹا مٹا سا، ٹوٹا ٹوٹا سا ہے اور دوسرا گمبھیر قسم کا صحت مند اور توانا ہے''۔ ''تو ان کا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' شاہدہ نے تنگ آ کر پوچھا تھا۔ ''مطلب عجیب و غریب ہے اور تمہیں سنانا ٹھیک نہیں ہے''۔ شاہدہ ایک دم سے بھڑک اٹھی تھی اور بھڑک کے بولی تھی، ''اب پہیلیاں نہ بجھایئے، صاف صاف کہئے۔ مجھے ایسا مذاق پسند نہیں ہے''۔ میں شاہدہ کے غصے میں ہمیشہ سے لطف لیتا تھا کہ وہ بالکل سرخ ہو جاتی تھی اور سرخ ہو کر تپے ہوئے سونے کا رنگ اختیار کر لیتی تھی اور ایسا رنگ مجھے بہت پسند تھا۔ بڑا دلکش معلوم ہوتا تھا۔ تو میں نے پیشہ ور جیوتشی کے تیور میں بتایا تھا، پہلا خط دراصل پہلی بیوی ہے اور یہ بیوی علم جیوتش کے اعتبار سے پھیکی

پھیکی سی ہے۔ مٹی مٹی اور ٹوٹی ٹوٹی سی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاہدہ مرجھا گئی تھی۔ اب کے وہ غصہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی جلد کی رنگت ایک دم سے سرخ ہونے کے بجائے پیلی پڑ گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہی تھی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا، دھیمے لہجے میں بولی تھی، ''لکیریں کیا کہتی ہیں ان سے مجھے بحث نہیں لیکن شاید آپ کا دل یہی کچھ کہتا ہے''۔ کہنے کو تو اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی لیکن میں اس دم کچھ سنجیدہ تو تھا نہیں کہ غور و فکر کرتا، بالکل مذاق کے تیور میں جواب دیا تھا ''ہاتھ کی لکیروں اور دل کے معاملات میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی دل وہ بات سوچتا ہے جو لکیر کہتی ہے۔ لکیروں ہی کا نام خیال، دل، چلن اور زندگی ہے۔ اسی لئے میرے ہاتھ کی لکیروں کا علاقہ دل سے ہے۔ یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے''۔ میری باتوں کا شاہدہ نے کیا اثر لیا تھا اس سے کوئی مطلب تو تھا نہیں، جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے اس کا داہنا ہاتھ کھینچ لیا اور اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ دراصل میں اس دم شاہدہ کی حسین لمبی ترشی ترشائی سرخ و سفید انگلیوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ انگلیاں میرے دل میں گڑ رہی تھیں کہ شاہدہ نے مجھے ٹوکا تھا، ''اب کچھ بولئے بھی کہ یونہی دیکھتے جایئے گا''۔ اور تب مجھے یاد آیا تھا کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ میں نے جھوٹ موٹ کہنا شروع کیا تھا، ''یہ تمہارے انگوٹھے کے علاقہ میں جو لکیر ہے وہ منزل تک نہیں جاتی۔ اس کے راستے ہموار نہیں ہیں۔ ایک جگہ سے یہ ٹوٹ بھی جاتی ہے اور یہ زندگی کی لکیر ہے۔ افسوس ہے کہ تم..... آگے تم خود سمجھ سکتی ہو''۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی کہ شاہدہ مجھ سے لڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے سرکشی کا سارا موڈ ہی ختم ہو گیا ہو۔ بجائے رنج ہونے کے بڑے مشینی انداز میں اس نے دریافت کیا تھا، ''میری ازدواجی زندگی کیسی ہے''۔ میں نے فوراً بھانپا تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی ازدواجی لکیر کے المیہ کی تصدیق چاہتی ہے۔ اور میں نے کہہ دیا تھا، تمہاری ازدواجی لکیر میری لکیر کی تصدیق کر رہی ہے۔ یہ بہت پھیکی ہے، مٹی مٹی اور ٹوٹی ٹوٹی سی ہے۔ شاہدہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ قبل اس کے کہ میں اسے کہہ دیتا کہ میں کوئی پامسٹ نہیں اور یہ سب مذاق تھا، میرے ایک دوست آ گئے تھے اور مجھے زبردستی سکنڈ شو سنیما لے گئے تھے اس لئے اس رات مجھے ۱۲ بجے کے بعد ہی گھر لوٹنا پڑا تھا جو میرے معمول کے خلاف بات تھی۔

بات آئی گئی ہو گئی تھی لیکن ایک دن نہ معلوم کس طرح غالبؔ کی شاعری پر ہم دونوں میں باتیں ہونے لگی تھیں۔ پھر غالب کی نجی زندگی کے بعض پہلو زیر بحث آ گئے تھے۔ شاہدہ کا اصرار تھا

کہ غالب چلن کے اعتبار سے اچھے آدمی نہیں تھے اور میں نے ان کے ازدواجی انتشار کی یہ وجہ پکڑ رکھی تھی کہ ان کی بیوی ذہنی اعتبار سے پسماندہ تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ غالب زندگی بھر منتشر رہے تھے۔ شاہدہ نے اچانک یہ کلیہ میرے سامنے پیش کیا تھا کہ مرد فطری طور پر بے وفا ہوتے ہیں۔ عورتیں مظلوم و معتوب ہیں۔ غالب جیسے شاعر بھی اس کلیہ سے اپنے کو مستثنیٰ نہ کر سکے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ شاہدہ کا علم سطحی نہیں ہے۔ وہ جتنی حسین ہے اتنی ہی باذاق بھی ہے۔ لیکن محض اپنی جمانے کے لئے میں نے کہہ دیا تھا، ''بھئی بیویاں تو اکثر مردوں کے گلے میں ڈھول ہوتی ہیں جنہیں ہر حال میں بجانا ہی پڑتا ہے۔ وہ جس قدر کم فہم اور سطحی ہوں اور یہ کم فہمی اور سطحیت عورتوں کی ملکیت ہیں جو کم و بیش ہر کا حصہ ہیں''۔ میں کچھ اور کہتا کہ شاہدہ نے میرے آخری فقرے کو پکڑ لیا تھا''۔ جب کہ کم فہمی اور سطحیت ہر عورت کے حصہ کی چیزیں ہیں تو پھر دنیا کی کوئی عورت بھی کسی مرد کو مطمئن نہیں کر سکتی''۔ میں نے فوراً اپنی مات محسوس کرتے ہوئے پہلو بدلا تھا۔ ''چلو اس بات سے تمہاری تسکین تو ہوگئی''۔ شاہدہ کٹ سی گئی تھی اور چپ ہوگئی تھی اور میں نے موضوع بدل دیا تھا۔

دراصل مجھے شاہدہ کو ستانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی کم عمری میں ایک سطحی سا عشق کیا تھا۔ اپنی اس سطحیت میں یہ فیصلہ کر بیٹھا تھا کہ میں کسی اور جگہ شادی نہیں کر سکتا۔ بغیر عشق کی شادی کا آخر مطلب کیا ہوتا تھا۔ لیکن میرے والدین میرے عشق کو خاطر میں لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے اور آخر کار میں شاہدہ سے بیاہ دیا گیا تھا۔ شاہدہ میرے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی تھی۔ بی۔ اے تک اس کی تعلیم تھی لیکن ذہن بڑا رسا پایا تھا۔ اسے کتابوں سے عشق سا تھا۔ صرف یہی نہیں اس کے جسم کی ساخت بڑی دلکش اور متناسب تھی۔ اس کی جلد کی رنگت پگھلے ہوئے سونے جیسی تھی۔ اس کی آواز مترنم تھی۔ چال میں تمکنت اور وقار تھا۔ وہ میرے لئے شاخ گل تھی، لچکتی اور لچک کر سیدھی ہو جاتی تو میرے نزدیک دو عالم روشن ہو جاتے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ مجھے اس کی محبت بڑی پیاری لگتی تھی۔ خصوصاً اس کا غصہ میرے لئے بڑا قاتل ثابت ہوتا۔ وہ سرکش ہو کر سرخ ہو جاتی تو میں مر جاتا اور یہ سرکشی اس وقت پیدا ہوتی جب میں اس میں کوئی عیب نکالتا، اپنے عشق کی روداد سناتا، دوسری لڑکیوں کی تعریف کرتا، اپنی ازدواجی زندگی غیر مطمئن بتاتا۔

اور وہ رات مجھے نہیں بھولے گی۔ میرے کالج میں شیکسپیئر کا ڈرامہ ''اوتھیلو'' اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ ڈائریکشن کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے اس کی کامیابی کے لئے بڑی محنت کی تھی۔ اوتھیلو

اور ڈیسیڈیمونا کے کردار کے لئے مناسب صورتوں کا انتخاب کیا تھا اور مسلسل ریہرسل سے انہیں فطری بنا دیا تھا۔

ہر چند کہ نزہت ریہرسل میں ڈیسڈیمونا کا کردار اچھا کر رہی تھی، مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا کہ کاش میں شاہدہ کو اسٹیج پر لا سکتا۔ لیکن یہ تو کالج کا ڈرامہ تھا، باہر سے کوئی کیریکٹر لایا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر میں اپنی بیوی کو اسٹیج پر لا بھی کیسے سکتا تھا..... تو میں نے شاہدہ کو ساتھ لے لیا کہ کم از کم وہ ڈرامہ دیکھ لے۔

ڈرامہ کامیاب ہوا تھا۔ نزہت نے اچھی اداکاری کی تھی۔ اور باتیں اسی موضوع پر ہونے لگی تھیں۔ میں نے کہا تھا ''نزہت تو واقعی ڈیسڈیمونا بن گئی تھی۔ غضب کی ایکٹنگ کی اس نے۔ شاہدہ نے جواب دیا تھا ''لیکن اس کا ایکسنٹ ٹھیک نہیں تھا۔ طرز گفتگو بے حد مصنوعی معلوم ہوا مجھے''۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے حسن نے ہر چیز پر پردہ ڈال دیا۔ غضب کی خوبصورت ہے یہ لڑکی۔ میں نے اپنے تاثرات تو بیان کر دیئے تھے لیکن شاہدہ سے مقابلہ مقصود نہیں تھا لیکن وہ بولی تھی ''میں نہیں جانتی کہ خوبصورتی کس کو کہتے ہیں اور آپ لوگوں کے آگے اس کا کیا معیار ہے۔ مجھے تو اس کی ناک پھیلی ہوئی معلوم ہوئی، آنکھیں بھی بڑی نہیں ہیں۔ رہی رنگت تو میک اپ میں اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے''۔ شاہدہ نے سیریس ہو کر تنقید کر دی تھی۔

میں پھر تنگ کرنے کے لئے موڈ میں آ گیا تھا۔ بولا ''اپنے چہرے پر کبھی نظر گئی ہے تمہاری جو ڈیسڈیمونا میں کیڑے نکال رہی ہو۔ میں تو اس شخص کو خوش قسمت سمجھوں گا جس کی نزہت بیوی بنے گی۔ اللہ رے اس کا شباب''۔ اور شاہدہ خاموش ہو گئی تھی۔ بالکل خاموش۔ راستے بھر مجھ سے بات نہ کی۔ رات کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ میرے اصرار پر طبیعت کی بدمزگی کا بہانہ کر کے سو رہی تھی۔

اور صبح مجھے اپنی آنکھوں کو پھوڑ لینا چاہئے تھا جو مجھ سے نہ ہو سکا تھا۔ شاہدہ نے خودکشی کر لی تھی اور ایک رقعہ چھوڑا تھا۔ ''میں نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ میں آپ کے لائق ثابت نہ ہو سکی۔ میں آپ اور نزہت کے درمیان دیوار بننا نہیں چاہتی۔ اب رخصت ہوتی ہوں میرے سرتاج''۔ میں نے اپنے بال نوچ لئے تھے۔

پروفیسر جمال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری آنکھیں بھی نم تھیں.....

☆☆　　(مطبوعہ: ''صبح نو''، پٹنہ، مئی-جون ۱۹۶۳ء)

ایک چوٹ، ایک موت

ٹوم نے پہلے اپنے گنجے اور بے حد صاف شفاف سر پر بیوقوفوں کی طرح ہاتھ پھیرا، پھر گلاس سے چھلکتے ہوئے بیر کے جھاگ کو غور سے دیکھا۔ پھر اپنے بہت گہرے دوست جیک کی طرف مخاطب ہوا اور بولا— ''آج بیئر جیسی چیز میرے لئے کافی نہیں ہے''۔

"Then whisky?" جیک نے بیئر کے جھاگ کو اپنے موٹے اور کھردرے ہونٹوں سے مس کرتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں، یہ بھی نہیں..... کچھ سخت سی چیز چاہئے۔ کچھ بہت کڑوی سی۔ کچھ دل کو جلا دینے والی۔ کچھ جسم کو بھسم کر دینے والی''۔ جیک کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مارے حیرت کے وہ اپنے گلاس کی نصف شراب پی گیا اور برا سا منہ بنا کر بولا— ''شاعری مت کرو''۔ "Dash poetry be practical"

''میں شاعری نہیں کر رہا ہوں دوست، مجھے ورڈسورتھ یا شیلی جیسی مخلوق نے کبھی متاثر نہیں کیا۔ میں ایٹمی دور کا آدمی ہوں، میٹر پر یقین رکھتا ہوں''۔ ٹوم نے ایک ہی سانس میں اپنا نظریۂ حیات بیان کر دیا۔

''تو ابھی ابھی کیا بک رہے تھے؟'' جیک سراپا سوالیہ نشان بن گیا۔

''بک نہیں رہا تھا، واقعی مجھے آگ کی ضرورت ہے۔ پگھلتے ہوئے شعلوں کی جنہیں میں حلق کے نیچے اُتار لوں تا کہ میرا وجود خاکستر ہو جائے''۔ ٹوم یہ کہتے ہوئے ساری بیئر پی گیا اور گلاس کو زمین پر دے مارا۔

''What this, you mad، آج تم نے بہت پی لی ہے''۔ جیک نے ٹوم کی اس حرکت کا برا مانتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں نے کچھ زیادہ نہیں پی ہے، یہ گلاس پہلا تھا جسے میں نے پیا ہے، یہ پہلا گلاس ہے جسے میں نے توڑا ہے۔ آج مجھے عجیب سا درد ہو رہا ہے۔ میرا دماغ پھٹ رہا ہے، میرا دَم گھٹ رہا ہے، میری روح گھبرا رہی ہے''۔ ٹوم شاید کچھ اور کہتا کہ جیک نے بیچ ہی میں اپنا

ریمارک پاس کر دیا۔

''Again poetry''۔ٹوم جیسے یکا یک غصے میں آ گیا اور اس نے جیک کا گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی پوری طاقت سے اسے زمین پر پٹک دیا۔''تم میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو۔ایک شرابی کی بے ہنگم گفتگو سمجھ رہے ہو۔ایک پاگل کی بڑ سمجھ رہے ہو۔نہیں، نہیں نہیں، مجھے آج زبردست چوٹ لگی ہے۔زندگی کی سب سے بڑی اور بے حد شرمناک شکست میرے حصے میں آئی ہے۔ایک چوٹ، ایک موت''۔ٹوم کی یہ آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی اور جیک ایکدم سنجیدہ ہو گیا اور بیئر کی دوسری بوتل اور تیسرے اور چوتھے گلاس کو اپنی طرف سمیٹتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔''آخر بات کیا ہے ٹوم؟ ?What is the matter۔تم اتنے Dejected کیوں ہو؟''

''میرا گلاس بھر دو، پھر سناتا ہوں''۔ٹوم نے بہت ہی نحیف آواز میں کہا:

''Here it is, tell the story۔میں سمجھتا ہوں کہ ڈیزی نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔پہلے مجھے اس کا احساس تھا۔ڈیزی بہت young ہے، ہم لوگ بہت old ہو چکے ہیں۔ وہ ہم لوگوں کے لئے Beyond reach ہے''۔

''نہیں جیک'' یہ بات نہیں ہے۔ڈیزی میری تھی۔اب بھی میری ہے۔ڈیزی مجھے فریب نہیں دے سکتی۔دراصل آج ایک بہت معمولی آدمی نے میرے وقار پر ضرب لگائی ہے۔ ضرب کاری''۔ٹوم نے کہانی سنانی شروع کی۔۔۔

You mean کسی نے تمہارے vanity کو Hit کیا ہے؟'' جیک نے کچھ سمجھتے ہوئے ٹوم سے دریافت کیا۔

''تم عزیز کو جانتے ہو جیک؟'' ٹوم نے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا،''وہی عزیز جو میری کمپنی میں آج سے ایک سال پہلے ملازم تھا!''

''تو پھر کیا ہوا؟'' جیک نے الجھن سی محسوس کی۔

''تو وہ عزیز میری کمپنی کا معمولی کلرک تھا، صحت مند، توانا، خوبرو، وہ دیکھنے میں بہت اچھا تھا اور اس کی انگریزی بہت اچھی تھی''۔

''تب تو وہ تمہارے کام کا آدمی تھا''۔جیک نے ٹوم کو ٹوک دیا۔

''ہاں آدمی کام کا تھا اور محنتی بھی، لیکن مغرور تھا، بہت مغرور..... جب میں

Inspection کے سلسلے میں اس کی میز اور اس کی فائل کے پاس پہنچتا تو وہ بے نیاز رہتا۔ ایکدم بے نیاز، جیسے میری اہمیت اس کی نظر میں کچھ بھی نہ ہو۔ نہ اور کلرکوں کی طرح اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہوتے، وہ بہت بے دلی سے کاغذات میرے سامنے کر دیتا جیسے وہ مجھے بہت معمولی آدمی سمجھتا ہو"۔ اتنا کہہ کر ٹوم نے لمبی سی سانس لی اور جیک نے کہا "Damn Aziz" ٹوم نے اپنے بھرے ہوئے گلاس کی طرف غور سے دیکھا اور یکا یک اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ جیسے پورا گلاس پی جائے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ شراب صرف ایک گھونٹ لے کر گلاس پھر میز پر رکھ دیا اور قدرے زور سے بولا— "ایک دن ہوا یہ کہ وہ دفتر میں سگریٹ پی رہا تھا۔ حالانکہ Prohibition کی تختی سامنے ہی دیوار پر آویزاں تھی۔ میں نے یہ صاف دیکھ لیا اور عزیز نے محسوس بھی کیا کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ لیکن اس کا ردعمل کیا ہوا اس پر؟ جانتے ہو جیک، کیا ہوا؟" اور جیک نے صرف اتنا کہا "کیا ہوا؟"

"اس نے سگریٹ پھینکا تک نہیں، وہ انتہائی بے تکلفی سے اس کے کش لیتا رہا"۔

"Spoilt man"۔ جیک تلخ سا منہ بنا کر اپنے حصے کی شراب پینے میں مصروف ہو گیا اور تب ٹوم پھر بولا— "مجھے عزیز بالکل برا لگنے لگا، میں اس کے وجود سے نفرت کرنے لگا اور میری نفرت اس درجہ بڑھی کہ میں نے اسے طرح طرح پریشان کرنا شروع کر دیا"۔

"That is very natural"، جیک بیچ میں پھر بولا۔

"اور اس کی چارج شیٹنگ کا موقع تلاش کرتا رہا"۔

"A just punishment"۔ جیک کے لئے بغیر کچھ بولے، محض ٹوم کی بات سنتے رہنا تقریباً ناممکن تھا۔ اور ٹوم نے نہایت افسردگی کے ساتھ کہا— "لیکن میری یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ عزیز بہت ہی چالاک نکلا۔ میں نے اتنا چالاک آدمی زندگی بھر نہیں دیکھا ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک بائیس سالہ نوجوان مجھے اس طرح زک دے دے گا"۔

"پھر ہوا کیا، Proceed Further جیک کو ٹوم کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔

عزیز نے اسی کشمکش کے دوران فرصت لے لی اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ یعنی اس نے ملازمت چھوڑ دی"۔

"You mean he resigned?" جیک نے ٹوم کی بات کی انگریزی کر دی۔

"ہاں اس نے Resign کر دیا اور میں کف افسوس ملنے لگا۔ مجھے غم تھا کہ میں سزا نہیں

دے سکا''۔ ''Then matter ends here''۔ جیک نے سوچا کہ کہانی بس ختم ہوگئی۔

''نہیں بات یہیں ختم نہیں ہوئی''۔ ٹوم نے آگے کہنا شروع کیا— ''ایک دن میرے ایک چپراسی نے مجھے ایک رقعہ دیا۔ یہ رقعہ دعوتی کارڈ تھا۔ جانتے ہو؟ یہ کس نے بھیجا تھا؟ میری کمپنی کا کلرک۔ میں اس طرح کی دعوت کا متوقع نہیں تھا۔ عزیز نے نمایاں طور پر ایم.اے کیا تھا اور اب وہ جشن منا رہا تھا۔ محض مجھے دعوتی کارڈ اگر بھیج دیا جاتا تو میں ہرگز اس تقریب میں شرکت نہیں کرتا۔ لیکن اس دعوتی کارڈ کے ساتھ عزیز کا ایک ذاتی خط بھی تھا۔ اس خط میں عزیز نے بہت کچھ لکھا تھا۔ میرے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ اپنے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ میری افسرانہ صلاحیت کی بڑی ہی تعریف کی تھی، ساتھ ہی ساتھ اپنے رویہ کے بارے میں مجھ سے معافی بھی چاہی تھی''۔

اتنا کہہ کر ٹوم خاموش ہوگیا اور جیک نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا— ''A riddle indeed''۔

اب ٹوم بہت ہی کمزور ہوگیا تھا۔ اس نے بہت ہی کمزور اور ویران سی آواز میں پھر کہنا شروع کیا.....اور میں اپنی تعریف پڑھ کر اندھا ہوگیا..... بالکل اندھا.....اور وقت معینہ پر میں عزیز کے گھر پہنچ گیا۔ عزیز بہت خندہ پیشانی سے ملا۔ اس نے اس دعوت میں چند مخصوص لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کھانے کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ میں اس وقت عزیز کو اچھا آدمی سمجھنے پر مجبور ہوگیا تھا اور پھر یہ دعوت ختم ہوگئی''۔

اور جیک نے زوروں سے کہا— ''Then!''

ٹوم یکا یک بہت ضعیف اور لاغر معلوم ہونے لگا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے بمشکل اتنا کہا—

''عزیز نے مجھے اپنے کتے سے ملایا۔ کہا کہ اس کتے میں بہت رعونت ہے، اور بتایا کہ اس نے اس کا نام ''ٹوم'' رکھا ہے''۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''ندیم''، ڈھاکا، فروری ۱۹۶۰ء)

...کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

جہاں افتخار نانا سے ملاقات ہوئی تھی وہ میری سسرال تھی۔ بیگم پور کوئی بہت بڑا گاؤں تو نہ تھا لیکن اس چھوٹی سی جگہ کی بہت سی چیزوں نے متاثر کیا تھا۔ خصوصاً افتخار نانا کی بوڑھی سی عجیب سی شخصیت مجھے بڑا لطف دیتی ہے۔

اس دن کچھ بھیگی بھیگی سی، سرد سردی شام تھی۔ ایسے میں سگریٹ کچھ زیادہ ہی پی جاتی ہے۔ تو میں نے کیپسٹن کی نصف ڈبیہ جو ختم کر دی تو نعیمہ کے بھائی نفیس نے کہا— ''بھیا کیپسٹن تو ملتا ہی نہیں۔ کچھ دیر اس طرح آپ دھواں پھینکتے رہے تو پھر آپ ہی سمجھئے، کل بیڑی پینی پڑے گی۔ بات معقول تھی، میں نے کہا، بس اب نہیں''۔

نفیس نے کچھ سوچتے ہوئے پھر کہا ''حقہ سے شوق ہے آپ کو''۔ کچھ ایسا تو نہیں ہے لیکن تم جانتے ہی ہو مفت کی شراب قاضی تک کو حلال ہوتی ہے۔ اور ہم افتخار نانا کے یہاں چل پڑے۔

میں نے دیکھا افتخار نانا کے سر پر بال گنتی کے ہیں اور بالکل اُجلے کپاس ہیں۔ آنکھیں سوئی ہیں، لیکن ان پر موٹے اور لٹکتے ہوئے پپوٹوں کا دبیز غلاف ہے۔ ناک بے حد پھیلی ہوئی نظر آئی، پورا چہرہ جھریوں کے درمیان بھی بڑا باوقار معلوم ہوا۔

آپ لوگ تو بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ''گلستاں'' تو پڑھی ہوگی آپ نے۔ پتہ نہیں پوری پڑھی کہ آدھی، میں نے دس برس کی عمر میں ہی اسے پڑھ لیا تھا۔ افتخار نانا نے پہلے سوال کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے بارے میں کچھ تفصیل بتائی۔

جی، مجھے فارسی بہت نہیں آتی، دراصل میں نے.....توبہ ہے، افتخار نانا نے میری بات کاٹ دی۔ توبہ، چھی آج کی تعلیم بھی کیا ہے۔ لعنت ہے ایسی پڑھائی پر، لوگ نہ جانے کیسے ایم.اے، بی.اے پاس کر جاتے ہیں لیکن فارسی نہیں جانتے۔ افتخار نانا کھانسنے کو رُکے۔

لیکن کوئی ضروری نہیں کہ فارسی.....، اب کے پھر افتخار نانا بیچ میں آ گئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی آدمی پڑھا لکھا آدمی فارسی نہیں جانتا۔ ٹیگور فارسی جانتے تھے۔ ''گلستاں''،

''بوستاں'' پڑھی تھی۔ لارڈ مونٹ بیٹن اچھی فارسی جانتا ہے۔

میں تو جیسے چکرا گیا اور چکرا کے صرف ان کا منہ تکنے لگا۔ افتخار نانا پھر بولنے لگے، ہزاروں انگریزوں کے نام میں انگلیوں پر گنا دوں، جن کو سیکڑوں فارسی کی کتابیں انگریزی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ میں نے گھبرا کر نفیس کو دیکھا جو اپنا رومال اپنے منہ میں ٹھونسے ہوئے تھا۔ میرے کانوں نے تب سنا کہ افتخار نانا کہہ رہے ہیں آج کے سائنس کی ساری ترقی ان ہی فارسی کتابوں کی وجہ سے ہے۔ انگریزوں نے فارسی سیکھ لی اور شیخ سعدی کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج پٹریوں پر ریل دوڑ رہی ہے، فضا میں ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں۔ میرے حلق سے صرف اتنا نکلا— ''آپ درست فرماتے ہیں''۔ تو پھر آپ ''گلستاں''، ''بوستاں'' جلد ہی پڑھئے۔ میں نے شکست مان لی اور کہا کہ آپ کا خیال درست ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نکل بھاگنے کی اجازت چاہی کہ افتخار نانا نے کہا— ''لیکن حقہ تو پیتے ہوں گے۔ آپ اگر نہیں پیتے تو پینا چاہئے۔ اس لئے کے حقے کے دھویں سے خون بنتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے موتی لال نہرو نے حقہ پلایا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ افتخار نانا اور کچھ بولیں گے اس لئے جلدی سے کہہ دیا، ''تو لائیے میں بھی پی ہی لوں''۔ افتخار نانا خوش ہو گئے۔ لیکن بولے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے زندگی کے پندرہ سال نہرو کے ساتھ گذارے ہیں، کیا پیارا آدمی ہے، مجھے بھیا بھیا کہتے اس کا منہ سوکھتا ہے۔

نفیس کو شاید شرارت سوجھی۔ اس نے کہا— ''اندرا تو شاید بہت شوخ ہے آپ سے''۔ یہ سنتے ہی افتخار نانا ہنسنے لگے۔ پھر ہنسی کے درمیان ہی بولے— ''ایک روز الہ آباد میں میں، نہرو اور اندرا چہل قدمی کر رہے تھے۔ نہرو آگے تھے، اندرا بیچ میں اور میں پیچھے۔ اب میں نے یوں ہی جو اندرا کو پیچھے سے چپت لگا دی تو اس نے نہرو سے کہا ''ابی ابی چاچا مارتے ہیں''۔ نہرو کو ہنسی آئے بغیر نہیں رہی۔ اس نے کہا، بھیا آپ کی اتنی عمر گئی، پر آپ بچوں کے ساتھ بچہ ہی بن جاتے ہیں۔ میں نے حقہ کا ایک لمبا کش لیا اور کہا—

آپ درست فرماتے ہیں، نہرو بہت اچھے آدمی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا اچھا اب چلا، پھر حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ اور جلد ہی باہر آ گیا۔ نفیس نے اپنے منہ کا رومال نکالا اور پھر ہم دیر تک ہنستے رہے۔ ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

پھر بہت دنوں تک میری ہمت نہیں ہوئی کہ افتخار نانا سے ملاقات کی جائے۔ جب بھی بیگم پور جاتا، میری سگریٹ ختم ہو جاتی۔ لیکن جرأت نہ ہوتی کہ افتخار نانا کے یہاں حقہ پی لیا

جائے۔ اسی دوران ان کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ بوڑھے لوگ بھی انہیں نانا ہی کہتے ہیں اور یہ کہ نانا ان کے نام کا ایک جزو ہے۔ افتخار نانا بالکل نامکمل ہو جائیں اگر نانا کا ٹکڑا ان کے نام سے الگ کر لیا جائے۔ گاؤں کے نوجوان غول بنا کر ان کے یہاں جاتے اور کئی چلمیں پی پی جاتے اور ان کی باتوں میں ہاں میں ہاں ملاتے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ افتخار نانا پہلے بہت امیر رہے تھے۔ امیر اس وقت تھے جب ان کے والد حیات تھے، اس وقت بھی رہے جب ان کے والد کی آنکھیں شروع شروع بند ہوئی تھیں۔ پھر شہروں کا انہیں چسکا لگا۔ پھر کوٹھے پر گئے اور جب وہاں سے واپس آئے تو امارت ان سے روٹھ چکی تھی۔ اور افلاس نے ان سے پیار کر لیا تھا۔ یہ رشتہ بڑا مضبوط رہا۔ کبھی کبھی افتخار نانا نے اس رشتہ کو توڑ دینے کی کوشش بھی کی۔ پر اس کی ڈور بہت مضبوط ثابت ہوئی اور یہ بندھے رہے، اس میں بالکل جکڑے رہے۔ اور ایک دن ہوا یہ کہ میں ٹم ٹم سے اتر ہی رہا تھا کہ افتخار نانا نے مجھے دیکھ لیا۔ بس شکایت کے دفتر کھول دیئے۔ میں ان سے بھاگتا ہوں۔ ان جیسے بوڑھوں میں رکھا ہی کیا جو کوئی ملنے آئے۔ اور میں نے بہانہ تراشا۔ دفتر میں ان دنوں بڑا کام رہتا ہے۔ اب جو گھر آتا ہوں تو سویا رہتا ہوں۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن سہم گیا۔ اب افتخار نانا کی باری ہے۔ بولے ''دفتر کا کام گھٹانا بڑھانا تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اس وقت میں ریلوے میں ملازم تھا۔ اور ریلوے کے قانون بڑے سخت تھے۔ مسلمانوں کو نماز پڑھنے تک کی اجازت نہیں تھی''۔ میں نے کہا کہ جی ہاں، اور وہ آگے کہنے لگے۔ تو مجھے بڑا غصہ آیا، میں نے کہا کہ نماز کے وقت فرصت لے کر ہی رہوں گا۔ اور اس عزم کے ساتھ بڑے صاحب کے چیمبر میں چلا گیا۔ میں ان کی ہمت کی داد دینے کے لئے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ انہوں نے بم مشل پھینکا۔ اور آپ جانتے ہی ہیں میں انگریزی کے 'الف'، 'ب' بھی نہیں جانتا۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا کہ میں صاحب کے سامنے دھڑا دھڑ فراٹے سے انگریزی بولنے لگا۔ صاحب تو ہکا بکا رہ گیا اور تب اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور فوراً حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی فرصت دی جائے۔ کیا روحانی طاقت آ گئی تھی اس وقت میری زبان میں۔ میں نے گھر آ کر شکرانے کی نماز پڑھی۔ اور میں نے سوچا کہ اگر افتخار نانا سے جلدی فرصت ملی تو شکرانے کی نماز میں بھی پڑھوں گا۔ پھر افتخار نانا نے میرے سامان کی طرف نظر اٹھا کے دیکھا اور بولے ''شہر سے کافی چیزیں لے آئے، عید کی نماز بیگم پور ہی میں پڑھیں گے آپ کیا؟'' میں نے جلدی سے اور مختصراً کہا۔ جی ہاں۔ تو وہ

بولے، لیکن عید کی نماز کا لطف بس شہر ہی میں ہے۔ گذشتہ سال میں نے پٹنہ لان ہی میں نماز پڑھی تھی اور ہوا یہ کہ میں دوسری صف میں ٹھیک ذاکر کی پشت پر تھا، اب جو اس نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے ایکدم پہچان لیا اور بولا— بڑے بھائی اور میرے پیچھے۔ آجایئے بغل میں۔ ذاکر حسین ڈاکٹر ہوکر بھی نہیں بھولا اور گورنر ہوکر بھی نہیں۔ میں نے زندگی کے اٹھارہ قیمتی سال اس کھلنڈرے کے ساتھ گذارے ہیں۔ میرے تو چیخ نکلنے والی تھی کہ نفیس آ گیا اور کسی طرح چھٹکارا ملا۔

پھر میں کئی سال بیگم پور نہیں گیا اور افتخار نانا کا کوئی حال مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اب کے جو یکا یک وہاں جانا ہوا تو ان کی خیریت نفیس سے پوچھی اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑا دکھ ہوا کہ اب ان کا آخری وقت ہے۔ بے حد بیمار ہیں۔ اور ایک دن پتہ چلا کہ بس اَب اور تب کی بات ہے۔ میں نے نفیس کو بلایا اور آخری بار افتخار نانا سے ملنے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ پلنگ میں بالکل سٹ سے گئے تھے۔ چہرہ دودھ سا سفید ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ تو میں ان کے سرہانے بیٹھ گیا اور کہا ''نانا میں ہوں اشرفی، پہچانئے''۔ ان کی زبان یکا یک کھل گئی، انتہائی نحیف ونزار اور ڈوبی اور ٹوٹی ہوئی آواز میں بولے— ''آپ سورۃ یٰسین میرے لئے پڑھئے۔ لارڈ براؤن گورنر بنگال کا دم نہیں نکل رہا تھا تو میں نے یہ سورہ پڑھی تھی، اور وہ فوراً جاں بحق ہو گیا تھا۔ آخری لفظ ادا کرتے ہی افتخار نانا خود جاں بحق ہو گئے۔ اور میری آنکھوں میں سیلاب امنڈ آیا۔

(مطبوعہ: ''سہیل''، گیا، افسانہ نمبر، نومبر-دسمبر ۱۹۶۰ء)

مسیحا کہیں جسے

خیریت ہوئی کہ مارتھا آ گئی، ورنہ ٹورسٹ ہوٹل کے سارے فرنیچر توڑ پھوڑ دیئے جاتے۔ بات کتنی معمولی سطح پر شروع ہوئی تھی لیکن پہنچی کہاں۔

ٹورسٹ ہوٹل اپنی سنجیدگی کے لئے شہر بھر میں مشہور ہے۔ ایسا خاموش ہوٹل دوسرا نہیں ہے شہر میں۔ اس کی عمارت، سجاوٹ اور اس کے صاف ستھرے اور تھوڑی انگریزی بولتے ویٹرز یہاں کے کسٹمرز کو بے حد متاثر کرتے ہیں، شاید مرعوب بھی کرتے ہیں۔ اسی اثر اور رعب کی وجہ سے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی لوگ خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایکدم خاموش۔ جیسے ٹورسٹ ہوٹل بہت ہی متبرک جگہ ہو۔ یہاں لوگ دبے پاؤں داخل ہوتے ہیں اور سیدھے کسی میز کے گرد کوشن لگی ہوئی کرسی پر دھنس جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی، ویٹرز کو بہت مہذب انداز میں کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دیتے ہیں اور چپ ہو جاتے ہیں۔ چپ ہو کر اپنے اردگرد دیکھنے لگتے ہیں۔ دزدیدہ نظروں سے ہوٹل میں آئی ہوئی لیڈیز کو دیکھتے ہیں۔ پھر ہوٹل کی چھت دیکھتے ہیں۔ چھت دیکھ کر اپنے ذہن میں اس ہوٹل کے مالک کے بارے میں کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ پھر ائیر کنڈیشنڈ کمروں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ پھر اپنے بارے میں، اور اس درمیان ویٹر ان کے آرڈر کی چیزیں لے آتا ہے۔

ٹورسٹ ہوٹل کے کسٹمرز کا یہی انداز رہا ہے۔ خاموش خاموش سا انداز۔ کچھ مہذب، مہذب سا، لیکن آج یہ انداز باقی نہ رہا۔ آج ایک میز تین ایسے احباب کے قبضے میں آ گئی تھی جو مختلف طبیعتیں رکھتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی گفتگو سے اپنے میلانات واضح کر دینا چاہتے تھے شاید۔ اس طرح ہوٹل کی خاموشی بری طرح مجروح ہو رہی تھی۔ ان کی آوازیں لحہ بہ لحہ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ ویٹرز حیرت زدہ تھے۔ دوسرے کسٹمرز بس چپ چاپ ان کی بحث سن رہے تھے۔ ایک نے اپنے بائیں کاندھے کو اُچکایا۔ اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کی، سگریٹ کے دھوئیں کا رنگ بنایا اور تب بولا — مجھے امریکن لائف ایکدم پسند ہے۔ آئی لائک اِٹ ویری مچ۔ بھیک منگے ہیں

وہ لوگ جو اس لائف کو ہیٹ کرتے ہیں..... دوسرے نے یکا یک اپنے اوپر سنجیدگی طاری کر لی۔ اپنے اُلجھے ہوئے اور بے تحاشہ بڑھے ہوئے بال پر ہاتھ پھیرا، اپنی پرانی میلی قمیض کے ایک سوراخ میں انگلی دی۔ انگلی سے سوراخ کو بڑھا کر اپنی میلی گنجی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے بعد یہ شعر پڑھا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

تیسرے نے دونوں کو ہی عجیب نظروں سے دیکھا۔ جیسے دونوں اس کی نگاہوں میں ایکدم بے وقوف ہوں۔ پھر اس نے اپنے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ لائی۔ اس کے بعد اپنی ٹوپی ٹھیک کی۔ پھر دونوں کو اپنی پیشانی دکھائی۔ پیشانی کے بیچ سیاہ سے داغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا— ''خدا کی قسم زندگی اسی کا نام ہے''۔ امریکی انداز میں سوچنے والا دوست بالکل ہکا بکا ہو گیا۔

میلی گنجی پہننے والا دوست مسکرایا اور بولا— ''یہ ایٹمی دور ہے، میرے مولوی۔ تمہارے سینے پر کسی مورچے میں گولی لگی ہے تو اس کا داغ دکھاؤ۔ دنیا بہت تیز بھاگ رہی ہے میرے بھولے دوست۔ دنیا بہت دور نکل گئی اور مذہب بہت پیچھے رہ گیا۔ انسان مذہب سے بلند ہو گیا ہے۔ انسان چاند پر پہنچ رہا ہے اور مذہب کی رسائی وہاں ممکن نہیں ہے''۔ ٹوپی والے دوست نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ٹائی والے دوست نے جلدی سے کہنا شروع کیا— ''ہو سکتا ہے تم درست کہہ رہے ہو۔ لیکن اس کنٹیکسٹ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ گریٹ لنکن نے کبھی نہیں چاہا کہ ہم چاند پر پہنچیں۔ اُف لنکن ڈیئر ڈاٹ ہم چاند پر اب تک پہنچ گئے ہوتے''۔

اب کے میلی گنجی والا دوست ہکا بکا ہو گیا۔ پھر اپنا سر کھجانے لگا۔ تب ٹوپی والے دوست نے کہا— ''بھاڑ میں جائے تمہارا چاند اور بھاڑ میں جائے لنکن۔ جب مذہب ہی کوئی چیز نہیں ہے تو پھر دنیا میں رہی کیا چیز۔ تم لوگوں کا دماغ چل گیا ہے۔ واقعی قیامت نزدیک ہے۔ ہاں قیامت''۔

ٹوپی والا دوست نہ جانے اور کیا کچھ کہتا کہ میلی گنجی اور پھٹی قمیض والا دوست بیچ میں بول پڑا— ''ہم میٹریلسٹ ہیں۔ قیامت پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ سب کھوکھلے ذہن کی پیداوار ہے۔ کارل مارکس کے کارنامے فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ مذہبی کتابوں سے چپکنے والے محض وقت

برباد کررہے ہیں۔ اگر کسی کو کچھ سیکھنا ہی ہے تو 'کارل مارکس' پڑھے''۔

ٹائی والے دوست میں شاید ضبط کی طاقت نہیں رہی۔ ''کارل مارکس'' کا نام سنتے ہی اس نے مٹھی بھینچ لی۔ پھر اسے میز پر پٹک کر اپنا بایاں کاندھا اُچکایا اور زور سے بولا— ''ڈیم یور مارکس۔ میں کہتا ہوں کہ آج کی ساری ٹریجڈی اسی ''مارکس'' کی لائی ہوئی ہے۔ دنیا بھر کے لفنگوں نے اسے اپنا الگ لیڈر مان لیا ہے اور اپنا اپنا پیٹ پکڑ کر کیپٹل بیچتے پھر رہے ہیں''۔

ٹوپی پہننے والا دوست یکا یک خوش ہو گیا۔ جیسے اس کے مطلب کی بات کہہ دی گئی ہو۔ پھر اس نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح پر کیا— ''تم سو فیصدی درست کہہ رہے ہو۔ اس بیہودہ کتاب نے لوگوں کا ایمان خراب کر دیا ہے۔ کہاں مارکس کی بکواس اور کہاں آسمانی کتابیں۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک''۔

میلی گنجی والے دوست نے اپنے دونوں دوستوں کو باری باری دیکھا پھر انہیں سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا— ''تم لوگ بڑی سطحی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارا ذہن شاید کچھ سوچنے سمجھنے پر آمادہ نہیں ہے۔ تم لوگوں نے ''مارکس'' سرے سے پڑھا ہی نہیں ہے۔ ''مارکس'' نے ہمیں عظیم فلسفہ حیات بخشا ہے۔ اسے اپنا کر انسانیت پنپ سکتی ہے۔ بھوک اور افلاس کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور دنیا امن کا سانس لے سکتی ہے''۔

''بس بس'' ٹائی والے دوست نے کہنا شروع کیا— ''ہمیں ماسکو یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ نہ سمجھو۔ ڈونٹ بچ می۔ ہم جانتے ہیں کہ رَشین کتنے خوش ہیں اور رَشیا میں کتنا پیس ہے''۔

''تم ٹھیک ہی کہتے ہو''۔ ٹوپی والے دوست نے ٹائی والے دوست کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''سنتے ہیں کہ روس میں قیامت کی درندگی ہے۔ وہاں کے حکام وہاں کے عوام کے نعوذ باللہ خدا ہیں۔ حد درجہ کی شہنشاہیت ہے وہاں۔ ذاتی آزادی تو بالکل سلب کر دی گئی ہے روس میں''۔

تم لوگ ایسی غلط بیانی پر کیوں تل گئے ہو آج''۔ میلی گنجی والے دوست کو الجھن ہو رہی تھی۔ ''کیا کسی کو اس حقیقت سے بھی انکار ہو سکتا ہے کہ روس دنیا کا سب سے کامیاب ملک ہے۔ کیا کسی کو اس سے اختلاف ہے کہ مارکس کا فلسفہ دنیا کا عظیم ترین فلسفہ ہے''۔

''مارکس وازاے فراڈ''۔ ٹائی والے دوست نے چیختے ہوئے کہا۔

''مارکس ملحد تھا''۔ ٹوپی والے دوست نے بھی زور ہی سے کہا۔

''اگر مارکس فراڈ تھا اور اس کا فلسفہ مہمل ہے تو پھر دنیا کے سارے اہم لوگ فراڈ تھے۔ ان

کی ساری کتابیں بکواس ہیں''۔

''یو مین لنکن بھی؟'' ٹائی والے دوست نے غصہ میں تقریباً تھرتھراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں لنکن بھی، مذہبی پیشوا بھی، آسمانی کتابیں بھی'' میلی گنجی والے دوست نے ایکدم لڑنے کے انداز میں جواب دیا۔

''یو آر گریٹ فول''۔ٹائی والا دوست بدزبانی پر آمادہ ہوگیا۔

''واقعی تم گدھے ہو''۔ٹوپی والے دوست نے اس میں بھی ٹائی والے کا ساتھ دیا۔

''تم دونوں نے مجھے گدھا کہا۔ میں تم دونوں کو ماردوں گا''۔میلی گنجی والا دوست کرسی اٹھا کر تن گیا۔

ٹائی والے دوست نے بھی جھٹ ایک کرسی اٹھالی۔

ٹوپی والا مارے ڈر کے الگ کھڑا ہوگیا۔

قریب تھا کہ کرسی ایک دوسرے پر چل جاتیں کہ مارتھا آ گئی۔ مارتھا ٹورسٹ ہوٹل کی رقاصہ تھی۔ وہ دونوں دوستوں کے درمیان آ کر بولی ''ویری بیڈ..... یو جنٹلمین.....تم جنٹلمین لڑانے مانگتا ہے۔چیئرز نیچار کھو''۔

دونوں دوستوں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر رکھ دیں۔

''یو شیک یور ہینڈ''۔

میلی گنجی والے نے ٹائی والے سے ہاتھ ملالیا۔

مارتھا سرعت کے ساتھ ہوٹل کے اوپر کی منزل پر چلی گئی۔

اور ٹوپی والا دوست پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں میں مل گیا۔

''مس مارتھا اِز اے نائس تھنگ''۔ٹوپی والے دوست نے کہا۔

''یہاں مجھے اختلاف نہیں ہے''۔میلی گنجی والے دوست نے اتفاق کیا۔

''واقعی خدا کی قدرت کا یہ چلتا پھرتا نمونہ ہے''۔ٹوپی والے دوست نے اپنی ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''سی، ہر بوٹیکس کتنا سیکسوئل ہے''۔ٹائی والے دوست نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور اب کے اپنا دونوں کا ندھا اُچکایا۔

''بڑا ہی مست انداز ہے۔اس کا پورا جسم شراب بھری بوتل معلوم ہوتا ہے''۔میلی گنجی

والے نے اپنی قمیض کے ایک اور سوراخ کو اپنی انگلی سے بڑا کرتے ہوئے کہا۔

''مار تھا دشمن دین وایمان ہے''۔ٹوپی والے دوست نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اپنے چہرے کو اِدھر اُدھر سے پونچھا۔

''وَن نائٹ''بس لائف کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے''۔ٹائی والے دوست نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور ایک بڑا سا رِنگ بنایا۔

''کاش میری زندگی میں بھی کوئی ایسی رات آتی''۔میلی گنجی والے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں''۔ٹوپی والے دوست نے اپنی پیشانی کے داغ کو رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔

اور ٹورسٹ ہوٹل میں ایک بار پھر خاموشی مسلط ہوگئی۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''صنم''، پٹنہ، افسانہ نمبر، ۱۹۶۰ء)

چھوٹی بہو

شریفن بوا، منگلن نانی، بڑی بھابی اور کالی دیا سب ایک جگہ جمع ہو گئیں اور کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

اتنے میں مریم دادی بھی سر ہلاتے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ گئیں۔ سب کی سب عورتیں مریم دادی کی طرف دوڑیں۔ ایک نے ان کی لاٹھی پکڑ لی، دوسری نے جھٹ انہیں بازو سے پکڑ لیا۔ کالی دیا دوڑی پیڑھی لے آئی۔ اور مریم دادی آہستہ سے اس پر بیٹھ گئیں۔

پہلے تو وہ ہانپتی رہیں۔ ہانپنے کے دوران ایک دو بار بولنے کی کوشش کی لیکن سانس تو گھوڑے کی رفتار دوڑ رہی تھی۔ زبان اوپر نیچے جاتی تو کیسے؟ جب مریم دادی کی سانس معمول پر آ گئی تو منگلن نانی سے پوچھا۔

''پورا کب ہے؟''

منگلن نانی شاید اسی سوال کے انتظار میں تھیں۔ سنتے ہی مریم دادی کے دائیں کان تک جھک گئیں اور زور سے بولیں۔

''نواں تو ابھی چڑھا ہے!''

مریم دادی جیسے سب کچھ سمجھ گئیں۔

ان کی پیشانی کی جھریوں میں تھوڑی دیر کے لئے کچھ اضافہ ہوا پھر وہ اپنے پوپلے منہ کو چلانے لگیں۔

''کاکو سے کنگڑی دیا کو بلا لو، حکمت شاہ سے گڑ دم کرا کے لے آؤ اور مجھے بہو کے یہاں پہنچاؤ''۔

کالی دیا کاکو دوڑی، بڑی بھابی باورچی خانے سے گڑ لانے چلی گئیں اور منگلن نانی خود مریم دادی کو سہارا دے کر انہیں اپنی بہو کے کمرے میں لے گئیں۔

منگلن نانی بہت پریشان تھیں۔ اور پریشانی کی بات بھی تھی۔ چھوٹے کی شادی کو

پورے پانچ سال ہو گئے تھے لیکن چھوٹی بہو کبھی امید سے نہیں رہی تھی۔ بہو ویسے تو ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ اس کا سگھڑاپا خاندان بھر میں مشہور تھا۔ یہی وجہ تھی شاید کہ منگلن نانی کے منہ پر اب تک قفل لگا ہوا تھا۔ ورنہ یہ بہو کو اب تک کیا کچھ نہ کہہ دیتیں۔ بڑے کے بیاہ کو تین ہی برس ہوئے تھے کہ انہوں نے بڑی بہو کو کیا کیا نہ کہہ دیا تھا۔ ''اپنی چربی کم کرو۔ چڑھی عمر میں شادی کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ ورنہ تین برس ہو گئے اب تک پاؤں بھاری نہ ہوتا کیا؟'' وہ تو خیر ہو گئی کہ بڑی کا جی تیسرے سال ہی متلانے لگا اور انہیں کچھ زیادہ سننے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن چھوٹی کی بات الگ تھی۔ ویسے تو یہ موٹی تازی ضرور تھی لیکن عمر کے زیادہ ہونے کی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اس لئے کہ لڑکی گاؤں ہی کی تھی۔ پیدا ہوئی تھی منگلن نانی کے سامنے، دودھ کا دانت ان ہی کے سامنے ٹوٹا تھا اور جوان بھی ان کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ اب جب منگلن نانی چھوٹی کی عمر کا حساب انگلیوں پر لگاتیں تو یہیں آ کے رک جاتیں، خمبن خمبن ایک، خمبن خمبن دو، خمبن خمبن اکیس''۔ اب اکیس برس کی چھوکری کو چڑھی عمر کہنا انہیں مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے یہ بڑی سے زیادہ ان سے لگی لپٹی رہتی تھی۔ کبھی ان کے سر کے جُوں نکال دیتی۔ جمعہ کے جمعہ جب منگلن نانی نہاتیں تو ان کے سر میں کڑوا تیل ڈال کر دیر تک دباتی رہتی۔ کبھی کبھی جب ان کے پاؤں میں درد اٹھتا تو یہ خوب خوب مالش کرتی۔ انہیں کوئی بڑا کام کرنے نہیں دیتی اور یہاں تک کہ بڑی اور بڑی کے بچوں کا بھی خیال رکھتی۔ اب جب اس میں اتنے گن تھے تو محض اس کی ایک بدقسمتی کہ اس کی گود جلد سے جلد کیوں نہیں بھر جاتی نظر انداز کر دینے کے قابل بات تھی۔ اور واقعی منگلن نانی نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کی زبان سے کبھی ایسی ویسی بات چھوٹی کے بارے میں نہیں سنی گئی۔ کبھی کوئی شکایت کا جملہ ان کے منہ سے نہیں نکلا۔ یہ بات اپنی جگہ پر حیرت انگیز تھی۔ کبھی کبھی بڑی کا منہ میلا بھی ہو جاتا، جب کبھی اسے اپنے دن یاد آتے۔ بڑی سوچتی، اس کی ساس چھوٹی کے لئے ماں بنی ہوئی ہے ورنہ نہ معلوم کیا سے کیا ہو جاتا۔ پانچ سال ہو گئے اور چھوٹے کے ایک چوہا تک نہ ہوا۔ مگر گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس قصہ کو خود آگے بڑھاتی۔ لیکن چھوٹی کا اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ سلوک دیوار کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا، اور پھر وہ چپ ہو جاتی۔ گاؤں بھر میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ منگلن کا جی پوتے پوتیوں سے بھر گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چھوٹی کی طرف سے بالکل مطمئن ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ منگلن نانی کے دل کا چور اکثر نمایاں ہو جاتا۔ ادھر وہ بی کمالو کی بارگاہ بار بار جانے لگی تھیں۔ اور چپکے سے چھوٹی کے ازار

بند کو چھوٹے کے ازار بند کے ساتھ باندھ کر درگاہ کے احاطے میں گاڑ آئی تھیں۔ ہر جمعہ کو بی بی کی چوکھٹ کی خاک شفالاتیں اور چھوٹی کے پیٹ میں یہ کہہ کے مل دیتیں کہ بی بی کی خاک سے صحت ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وہ باضابطہ درگاہ میں چلّہ کش ہوگئی تھیں اور بی بی کے یہاں عرضی پیش کی تھی کہ اگر چھوٹی کے یہاں خوشی ہوئی تو وہ باجے گاجے کے ساتھ مزار پر چادر چڑھائیں گی اور مالیدہ کی فاتحہ دیں گی اور گھی کے ایک درجن چراغ جلائیں گی۔ ادھر حکمت شاہ کے یہاں بھی ان کا آنا جانا روز ہی ہونے لگا تھا اور شاہ صاحب نے بھی صبح اور شام کے الگ الگ تعویذ لکھ دیئے تھے۔ منگلن نانی نے چھوٹی کو یہ کہہ دیا تھا کہ وقت کے حساب سے انہیں پہننے پر روزی بڑھتی ہے اور شوہر کی آمدنی میں ترقی ہوتی ہے۔ بھلا چھوٹی اپنے شوہر کی ترقی کب نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے حکمت شاہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر ہی انہیں پہننا، اتارنا شروع کیا۔ اور منگلن نانی کو اس دن کا انتظار رہنے لگا کہ چھوٹی ان سے کہے کہ اس کا جی بھاری بھاری سا لگتا ہے۔ کھٹا کھانے میں اچھا لگتا ہے!

اور ایک دن تو عجیب بات ہوئی۔

اس دن املی کی چٹنی بنی تھی۔ چھوٹی کو املی کھانے کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اس نے روٹی میں چٹنی ملا ملا کر کھانا شروع کیا تو منگلن نانی کا جی اندر سے ایک دم خوش ہوگیا۔ وہ جذبات پر قابو نہیں پاسکیں اور پوچھ ہی بیٹھیں۔

''بہو! کھٹا کب سے کھانے لگی ہو؟''

اور جب چھوٹی کچھ نہ سمجھی اور انتہائی معصومانہ انداز سے بولی کہ ''بچپن ہی سے!''

تو منگلن نانی کا منہ بالکل اتر گیا۔

ٹھیک اسی وقت روٹی کے ساتھ ایک کنکڑ ان کے منہ میں پڑ گیا۔ کنکڑ دانت تلے آتے ہی ان کا پارہ ایک دم چڑھ گیا اور روٹی کو ایک طرف الگ کر کے چھوٹی پر برس پڑیں۔

اللہ نے آنکھیں تو دی ہیں۔ یہ موٹا دیدہ کس کام کا ہے۔ آگے کی چیز تو تم کو سوجھتی نہیں۔ آنکھ رہتے، اندھی ہو۔ پہاڑ اِتنا بڑا کنکڑ بھی نہیں سوجھتا۔ جیسے تیسے پکا دیتی ہو''۔

چھوٹی بچاری بھیگی بلّی بنی رہی۔

قصور تو تھا ہی اس کا۔

آخر اسے آٹا گوندھتے وقت کنکڑ کیوں نہ سوجھا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہوا۔

چھوٹی کا دانت مانجھتے ہوئے خون نکل آیا۔ اس نے آہستہ سے مٹی اٹھائی اور خون نکلنے کی جگہ پر رکھنی چاہی کہ منگلن نانی نے دیکھ لیا۔

منگلن نانی یکا یک خوش ہوگئیں۔

اور بولیں۔

''بہو مٹی مت کھایا کرو!''

اور جب بہو نے جواب دیا کہ دانت سے خون بہہ رہا ہے، اسی لئے مٹی وہاں رکھنا چاہتی ہے، تو جیسے ان کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

''عجیب ہو بہو! اس طرح بھی کہیں دانت مانجھتے ہیں کہ خون نکل آئے! جانتی ہو خون کتنی مشکل سے بنتا ہے؟ تمہیں کیا ہے پڑ جاؤ بیمار۔ بیماری آئی گئی تو مجھ پر پڑے گی۔ اللہ جانے تمہیں عقل کب ہوگی۔''

اور چھوٹی سوچتی رہی کہ دانت سے خون نکل گیا تو کیا ہوا؟ اور پھر اس سے صحت کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

اور ایک دن منگلن نانی نے دیکھا کہ چھوٹی نے باورچی خانے ہی میں سر کو دیوار سے ٹیک دیا ہے اور آنکھیں بند کرلی ہے۔ منگلن نانی یکا یک پریشان ہوگئیں۔ جلدی سے پانی کی دو چار چھینٹیں دیں، جب چھوٹی کو کچھ ہوش آیا تو وہ ایک دم شرما سی گئی۔

منگلن نانی کا جی باغ باغ ہوگیا۔

دوسرے ہی دن سے چھوٹی پر طرح طرح کی پابندی لگادی گئی۔

''یہ کام نہ کرو، وہ کام نہ کرو، زور زور سے مت چلو، پلنگ تم مت کھینچو، شبنم میں مت سوؤ!''

گاؤں بھر میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ چھوٹی کا پاؤں بھاری ہے! چھوٹی کے دن چڑھ رہے تھے۔ اس کا بدن ڈھیلا ہوتا جارہا تھا۔ آنکھوں کی رونق غائب ہوتی جارہی تھی۔ چہرے پر بڑی ہی پژمردگی تھی۔ اس کے انگ انگ میں کمزوری سما گئی تھی۔ پیٹ اونچا ہوتا جارہا تھا۔ اور اب وہ خود کو سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ دن بھر پلنگ پر لیٹی رہتی۔ منگلن نانی اسے ہر طرح کا آرام دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ طرح طرح سے اس کی ہمت بندھاتیں۔ ماں بننا کتنی عظیم بات ہے۔ مثالوں سے سمجھاتیں۔ اس طرح کہ چھوٹی شرما جاتی اور کبھی کبھی چڑ بھی جاتی۔

اور اب نواں مہینہ چڑھ گیا تھا چھوٹی کا۔

وہ بہت ہی لاغر اور کمزور ہوگئی تھی۔

اس کے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا تھا، لیکن شرم سے اب تک وہ کسی کو کچھ نہیں کہہ پائی تھی۔ لیکن جب درد بہت بڑھ گیا اور اس کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تو اس نے کالی دیا کو بلایا اور اپنی طبیعت کا حال کہہ سنایا۔ اب کیا تھا۔ کالی دیا دوڑی دوڑی منگلن نانی کو سب کچھ بتا آئی۔ شریفن بوا بھی آ گئیں اور بڑی بھابی بھی۔

کھسر پھسر شروع ہوگئی۔

سب سے تجربہ کار اور ضعیفہ مریم دادی کو بھی بلوا بھیجا گیا۔

مریم دادی نے آتے ہی مورچہ سنبھال لیا۔ اور ہدایتیں دینے لگیں۔ طور طریقے بتانے لگیں۔

آج چار روز ہو گئے پر چھوٹی کو کچھ نہ ہوا۔ مریم دادی کا سارا تجربہ ناکام ہو گیا۔ بڑی بھابی کو سکتہ ہو گیا۔ شریفن بوا کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے اور منگلن نانی نے درگاہ اور حکمت شاہ کے دروازے ایک کر دیئے۔ حکمت شاہ نے پورے پچاس روپے لئے اور دس بار پانی پڑھا اور پانچ نئے تعویذ دیئے۔ گڑ کے بدلے چینی پر دم کیا اور چھوٹی کو کھلایا۔ تقریباً پاؤ بھر خاکِ شفا پانی میں گھول گھول کر چھوٹی کو پلا دی گئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

حکمت شاہ مصر تھے کہ چھوٹی بری ہوا کی زد میں آ گئی ہے۔ اور بھاری خبیثوں نے پیٹ کے بچے کو جکڑ لیا ہے۔ مریم دادی نے بھی اپنے پوپلے منہ سے اور ہلتے ہوئے سر سے پھونک پھانک شروع کر دی تھی۔ گھر بھر میں انتشار اور پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔

چھوٹی اب بولنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

اور آخر کار گاؤں کے ایک پڑھے لکھے آدمی نے چھوٹی کو شہر کے ہسپتال میں پہنچا دیا۔

ڈاکٹروں نے بتایا کہ چھوٹی کے پیٹ میں بچہ نہیں ہے۔ اسے بہت ہی خطرناک مرض پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے پیٹ اتنا بڑھ گیا ہے۔ مرض اب لاعلاج ہو چکا تھا۔

تین گھنٹے تک معالج چھوٹی کے علاج میں لگے رہے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ چھوٹی کو تین ہچکیاں یکے بعد دیگرے آئیں اور وہ مر گئی۔

آج چھوٹی کا چہلم تھا۔ گھر بھر میں آہ و بکا کا بہت ہی غمناک منظر تھا۔

منگلن نانی بین کر کے رو رہی تھیں۔ بڑی بہو شریفن بوا کے گلے سے لپٹی سسک رہی

تھیں۔ کالی دیا قل کا چنا اور خوشبودار تیل کا انتظام کر رہی تھیں!

اور تب مریم دادی نے منگلن نانی سے کہا۔

''اب چپ رہ پگلی! جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ یہ دنیا تو آنی جانی ہے، مت رو مرنے والی کا جنازہ بھاری مت کر''۔

منگلن نانی نے اتنا کچھ سنا تو اور زور سے رونے لگیں۔ دوسری عورتوں نے بھی اتنے ہی زور سے ان کا ساتھ دیا۔

''ہائے میری اچھی بہو! میرے سر میں اب تیل کون دے گا۔ میرا پاؤں کون دبائے گا؟''

اور گاؤں کی دوسری عورتوں نے منگلن نانی کے اس بیان پر بھیگی ہوئی آنکھوں سے اور رندھے ہوئے گلے سے ان کی باتوں کی تصدیق شروع کی۔ جب یہ رونا دھونا دیر تک ہوتا رہا تو مریم دادی جیسے اکتا گئیں اور اپنے سر کو سنبھالتے ہوئے اور ایک جگہ ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہوئے منگلن نانی سے زور سے کہا۔

''اب چپ بھی رہ سب کچھ تو تھی، پر بانجھ تھی!''

اور منگلن نانی یکا یک خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے آنچل کے کونے سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ لئے۔

مٹی کا مادھو

اور اس دن وہ سب کچھ نہ ہوا جو باندی نے سوچا تھا۔

ریاض صاحب نے باندی کے ہاتھ سے رقعہ لے لیا۔ پڑھا اور جیب میں رکھ لیا۔ پھر جیب سے نکال کر اسے اپنی بیگم کے حوالے کر دیا۔ بیگم نے رقعہ کو بغور پڑھا۔ منو صاحب کی خیریت پوچھی اور کہا کہ اسے بیس روپے ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ملا کریں گے اور جب باندی نے اپنی منظوری دے دی تو بیگم اسے کام سمجھانے لگیں۔ گھر کی صفائی تمہارے ذمہ رہی۔ برتن تمہیں صاف کرنا پڑے گا۔ دھوبی کے مال کا حساب بھی تم ہی رکھو گی، دسترخوان پر کھانا تم چنو گی۔ کھانا میں خود پکاؤں گی۔ بیگم صاحبہ نے ایک ہی سانس میں باندی کو اس کی ڈیوٹی بتا دی۔ باندی کو ایک دم ایسا لگا کہ یہ گھر اور گھروں کی طرح نہیں ہے اور یہ کہ یہاں کے لوگ دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔

باندی نے ہوش سنبھالا تھا تو نوکرانی تھی۔ جب اس نے ہوش نہیں سنبھالا تھا تب بھی نوکرانی تھی۔ بچپن سے اب تک اس نے کتنے ہی گھر بدلے تھے اور اسے کتنے ہی صاحبوں اور بیگموں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ اور اب اس کی عمر بیس کی ہو چکی تھی۔ باندی طبیعت کی ایسی نہیں تھی کہ ایک گھر میں اس کے پاؤں نہیں جمتے ہوں بلکہ بات ہی کچھ ایسی ہو جاتی تھی کہ اسے لگی ہوئی نوکری چھوڑنا پڑتی تھی اور نئی تلاش کرنا پڑتی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ باندی کا ناک نقشہ بڑا ہی جاذب نظر تھا۔ چھوٹی سی پیشانی کے نیچے اونچی سی ناک اور ناک کے اوپر دو موٹی موٹی سیاہ آنکھیں۔ پورا چہرہ لال بھبھوکا، پھر قد کی بھی پوری اونچی۔ جسم کی اس ساخت پر جوانی نے کچھ اس طرح حملہ کیا تھا کہ باندی سرتاپا جوانی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں کسی ایک گھر کی ہو کر رہ جانا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ باندی کبھی کسی صاحب سے آلو کے مزے کے بارے میں گفتگو کرتی ہوتی اور کہیں ان کی بیگم اس منظر کو دیکھ لیتیں تو پھر باندی کو چھٹی مل جاتی اور ہمیشہ کے لئے۔ کبھی کسی صاحب کے کوئی صاحبزادے باندی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے اس کا ہاتھ دبا دیتے تو باندی خود بغیر کسی کو کوئی وجہ بتائے وہ گھر چھوڑ دیتی۔ کبھی یہ ہوتا کہ کوئی صاحب اپنے اور بیگم کے لئے پکچر جانے کے

لئے ٹکٹ منگواتے، لیکن ٹھیک شو کے وقت ان کے سر میں درد ہونے لگتا تو وہ اپنی بیگم کو نوکر کے ساتھ سنیما ہاؤس بھیج دیتے اور خود اکیلے گھر میں رہ جاتے۔ پھر ان کا درد اس قدر بڑھ جاتا کہ وہ باندی کو آواز دے کر باورچی خانے سے بلانا چاہتے اور سر میں تیل دینے کے لئے کہنا چاہتے تو باندی کمرے میں نہیں جاتی اور دروازے سے نکل جاتی اور اس گھر میں پھر کبھی نہیں داخل ہوتی۔ اس قسم کے واقعات باندی کے ساتھ ہمیشہ ہوتے اور باندی ہمیشہ ہی صاف نکل جاتی۔ لیکن منو صاحب کے یہاں یہ سب کچھ نہ ہوا پھر بھی اسے نوکری ڈھونڈنا ہی پڑی۔

منو صاحب ساٹھ کے ہو چکے تھے اور ان کی بیگم کے بال پکنے لگے تھے۔ ابھی چند ہی سال ہوئے تھے، ریلوے کی کلرکی سے ریٹائر ہوئے۔ لیکن گھر کی حالت دیگر گوں ہونے لگی تھی۔ بغیر اولاد اور بغیر ملازمت کے ضعیف جوڑے پر ایک نوکرانی کا بار۔

منو صاحب آدمی تھے ڈھنگ کے۔ باندی کو انہوں نے کبھی یہ نہ کہا کہ ان کے یہاں اب نوکرانی کی ضرورت باقی نہ رہی، بیگم صاحبہ بھی خیر سے وضعداری کی قائل تھیں۔ انہیں باندی کو صرف مالی حالت کے خراب ہونے کی بنا پر الگ کرنے میں بڑی شرم آتی تھی۔ باندی یہ سب کچھ سمجھ رہی تھی اور آخر ایک دن اسے ایسا لگا کہ وہ اس گھر میں محض بے کار ہے۔ تو پھر وہ منو صاحب کے پاس گئی اور ان سے کہا، حویلی میں اب کچھ زیادہ کام نہیں رہتا ہے اس لئے اب اس کی ضرورت غالباً نہیں رہی۔ منو صاحب باندی کی شرافت کے قائل تو پہلے سے تھے ہی اب اور ہو گئے اور فوراً ریاض صاحب کے نام رقعہ لکھا اور باندی کو رکھ لینے کی سفارش کی۔ اب جب ریاض صاحب نے رقعہ ہاتھ سے لیا اور پڑھ کر جیب میں رکھ لیا اور پھر اسے نکال کر اپنی بیگم کے حوالے کر دیا، اور اسے ایک نظر دیکھا تک نہیں تو باندی کو کچھ عجیب سا لگا، پھر بیگم نے رقعہ پڑھتے ہی ایک دم سے اس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ یہاں تک کہ کام بھی سمجھا دیا تو اسے اور بھی تعجب ہوا۔

جوان شوہروں والی جوان بیویاں عموماً باندی کو اپنے یہاں نوکری دینے پر آمادہ نہیں ہوتی تھیں، پتہ نہیں کیوں؟ حالانکہ ان میں سے اکثر عورتیں ایسی تھیں جو اسے دیکھتے ہی کچھ مرعوب سی ہو جاتی تھیں۔ اور معاً ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ باندی اگر ان کے یہاں کام کرے تو گھر میں خاصی رونق آ جائے لیکن یکا یک وہ اپنا آپ دیکھتیں۔ کچھ غور کرتیں پھر اپنے شوہروں کی طرف دیکھتیں اور انتہائی غیر متعلق سی بات کہہ دیتیں کہ آخر ایسی کون سی ضرورت پڑ گئی ہے کہ نوکرانی رکھی جائے اور ان کے شوہر کچھ ڈرتے ہوئے اور کچھ مسکراتے ہوئے کہتے کہ "لیکن تم ہی نے تو کہا

تھا کہ ایک نوکرانی''، اور بیویاں بات کاٹتے ہوئے کہتیں کہ وہ تو مذاق کی بات تھی۔ باندی کو چند لمحے کے لئے اپنا سراپا بہت برا لگتا۔ پھر اس کے اندر کی کوئی چیز جاگ جاتی اور اس کی گردن تن جاتی اور وہ بڑے فخر سے ان گھروں سے نکل جاتی۔ اور ان بیویوں کے شوہر اس کے اٹھتے ہوئے قدم کو دیکھتے۔ اس کی پشت دیکھتے، پھر اپنی بیویوں کو دیکھتے اور جب باندی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو کچھ جھنجھلائے ہوئے انداز میں اپنی بیویوں سے پانی مانگتے اور پانی پی کر باہر نکل جاتے۔

ریاض صاحب جوان تھے اور حسین تھے۔ ان کی بیگم جوان تھیں، لیکن حسین نہیں تھیں۔ ریاض صاحب نے باندی کو رقعہ ہاتھ میں لیتے ہوئے دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بیگم نے باندی کو دیکھا، ریاض صاحب سے رقعہ لیا، پڑھا اور کام پر رکھ لیا۔ باندی کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع طور پر ہوا تو اسے تعجب ہونا ہی چاہئے تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس تعجب کے ساتھ اس کے دل میں کچھ اور بھی ہوا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل نے چاہا کہ ریاض صاحب اسے ایک بار دیکھیں۔ بیگم اسے دیکھ کے اپنا آپ دیکھیں۔

باندی ریاض صاحب کے یہاں نوکرانی تھی اور صرف نوکرانی تھی۔ جسے اپنے حصے کے کام سے غرض تھی۔ اور بس ابتدا میں تو رشتہ یہیں تک رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ باندی بیگم سے قریب آنے لگی اس کی خاص وجہ تو یہی تھی کہ بیگم بے حد غریب نواز قسم کی عورت تھیں۔ یہ غریب نوازی بعد میں محبت کی حد کو پہنچی۔ ویسے گفتگو ہی کے دوران باندی یہ سوچ لیتی کہ وہ اپنی بیگم سے بات کر رہی ہے اور کبھی بیگم کو خیال آجاتا کہ نوکرانی محض ہے۔ پھر دونوں ہی اپنے اپنے خیال کو اپنے دل سے نکال دیتیں اور تب دونوں صرف عورت ہو جاتیں۔ صرف اتنا رہتا کہ ایک کرسی یا پلنگ پر بیٹھی ہوتی دوسری زمین پر ہی۔ اس قدر قربت کے باوجود باندی بیگم کی بہت ساری باتیں نہیں سمجھ پاتیں اور وہ باتیں اکثر اس کے ذہن کو پریشان کرنے کا باعث بنتیں۔ کتنے ہی سوالیہ نشان اس کے دماغ میں ابھرتے اور پھر جواب پائے بغیر ڈوب جاتے۔ باندی بعض باتوں کے بارے میں بیگم سے کچھ پوچھنا چاہتی لیکن وہ مجبور تھی۔ آخر اسے بیگم کے ذاتی معاملات میں کیا دخل؟ اور اگر دخل ہو بھی تو ہر بات پوچھنے کی نہیں ہوتی۔ بیگم ہر دوسرے روز غسل کرتیں جب کہ ریاض صاحب بغیر غسل کئے دفتر نہیں جاتے اور دفتر جانا روز ہی ہوتا تھا، سوائے اتوار کے، تو اتوار کو ریاض صاحب نہیں نہاتے۔ غسل کا معمول تو یہ تھا لیکن ان کے پلنگ کی چادریں ہفتوں نہیں بدلی جاتیں۔ یہ بات تعجب کرنے کی ایسی خاص تو نہیں تھی۔ لیکن باندی کے لئے حیرت کی بات یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ ان کے پلنگ کی

چادریں ہفتوں تقریباً اس حالت میں ہوتیں جس حالت میں وہ بچھائی جاتیں۔ جیسے رات کے وقت ان پر کوئی سو گیا ہو اور پھر اٹھ گیا ہو۔ نہ اس کے آگے نہ اس کے پیچھے کچھ۔ باندی کو اس بات کی بھی حیرت تھی کہ ریاض صاحب آخر بیگم کے شوہر ہیں۔ لیکن بیگم کا سلوک ان کے ساتھ کچھ عجیب ہی ہے۔ ریاض صاحب دفتر سے آئے، بیگم نے ناشتہ سامنے کروا دیا اور قصہ ختم۔ پھر وہ رات کے نو بجے تک تنہا کمرے میں ہیں اور بیگم رات کے دس بجے تک باورچی خانہ میں۔ ادھر ریاض صاحب بھی عجیب ہی ہیں۔ ان کے لئے بیگم کی موجودگی یا عدم موجودگی شاید ایک ہی چیز ہے۔ باندی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ریاض صاحب اور بیگم کے بیچ لڑائی ہے۔ تعلقات خراب ہیں تب ہی تو..... لیکن تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ان کے درمیان تو تو میں میں کبھی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ریاض صاحب کے لئے باندی کے دل میں ہمدردی سی ہو جاتی۔ اس کی ایک وجہ تو خود بیگم تھیں۔ دوسری وجہیں ان گنت تھیں۔ سوائے منو صاحب کے تمام صاحبوں نے باندی کی جوانی کو شدت سے محسوس کیا تھا اور اپنے اس احساس کا کسی نہ کسی طرح باندی سے اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن ریاض صاحب تو جیسے صاحب ہی نہیں تھے۔ بیگم کی موجودگی یا عدم موجودگی ان کے لئے برابر تو تھی ہی باندی کی بھی موجودگی یا عدم موجودگی ان کے لئے برابر ہی تھی۔ اپنے تجربے کی روشنی میں باندی کو ریاض صاحب کا کردار بالکل نیا معلوم ہوا لیکن یہ کردار کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ نہ جانے کیوں اب وہ شدت سے محسوس کرنے لگی تھی کہ ریاض صاحب اسے ایک نظر دیکھتے، ہنس کے بولتے، غصے میں ڈانٹ دیتے، پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے وقت اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا دیتے۔ لیکن ریاض صاحب یہ سب کچھ نہیں کرتے اور اس کے دماغ میں نئے سوالیہ نشانات ابھرتے اور ڈوب جاتے۔

باندی کے معاملے میں ریاض صاحب کا رویہ تو یہ تھا۔ بیگم نے بھی اسے کچھ کم حیرت میں نہیں ڈالا تھا۔ عموماً اتوار کے دنوں ہی بیگم رکشہ منگواتیں اور پکچر چلی جاتیں۔ ادھر ریاض صاحب اور وہ تنہا رہ جاتے۔ ان موقعوں پر باندی کو ایسے گھر یاد آتے جہاں کی بیگمیں اپنے شوہروں کے نزدیک کبھی تنہا نہیں چھوڑتیں۔ اور یکا یک اس کے دماغ میں ریاض صاحب اور بیگم کے بارے میں سوالیہ نشانات ابھرتے اور ڈوب جاتے اور یہ سوالیہ نشانات زیادہ ابھرنے اور ڈوبنے لگے۔ جب شدو یہاں نوکر رکھ لیا گیا۔ جس ڈرامائی انداز میں باندی وہاں نوکرانی ہوئی تھی، اسی انداز میں شدو کو اچانک رکھ لیا گیا۔ حالانکہ باندی نے بیگم سے صرف اتنا کہا تھا، اسے تو کام مل بھی جاتا ہے لیکن اس کا بھائی شدو بیکار ہی رہتا ہے اور اس بیکاری سے اس کی جوانی کو گھن لگتا جا رہا ہے۔ اتنا سنتے ہی بیگم

ایکدم غصّے کے انداز میں بولیں کہ شدو کے بارے میں انہیں پہلے کیوں نہ بتایا گیا۔ اور دوسرے ہی دن وہ وہاں نوکر تھا۔ باندی کے لئے بیگم کا دل کشادہ تھا ہی، شدو کے لئے بھی ان کا دل اتنا ہی کشادہ رہا۔ اب وہ شدو سے ہنس بول لیتی تھیں، تو اس میں تعجب کی کیا بات تھی؟ لیکن باندی کے لئے تعجب کی بات پھر شروع ہوئی جب اس کے اور شدو کے کام کے اوقات یکا یک تقسیم کر دیئے گئے۔ اب باندی کو دن کے تین گھنٹے آرام کے ضرور مل گئے لیکن باندی کے دماغ کو آرام نہ مل سکا۔

ریاض صاحب سے بیگم کا سلوک، پھر شدو کے ساتھ ان کا برتاؤ اور یہ کام کے اوقات کی تقسیم۔ باندی کے دماغ میں کتنے ہی سوالات جنم لیتے، رینگتے اور پھر ساکت ہو جاتے۔

اور اس دن تو باندی کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ یہ اور بات ہے کہ اس دن کے بعد اسے پھر کبھی حیرت نہیں ہوئی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ ریاض صاحب نے بیگم سے مذاق کرنا چاہا تھا اور مصنوعی داڑھی ٹھڈی سے لگا کر نئے آدمی بن گئے تھے۔ اب جب بیگم کمرے میں گئیں تو ان کے منہ سے چیخ ہی تو نکل گئی۔ باندی اور شدو دوڑتے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ ریاض صاحب نے گڑبڑا کر جلدی سے داڑھی نوچ لی اور بیگم یکا یک بول پڑیں توبہ ہے، میں تو سمجھی کوئی مرد ہے۔ اور باندی کو بڑی حیرت ہوئی کہ آخر بیگم نے یہ کیا کہہ دیا۔ دوسرے لمحے باندی کی نظر شدو پر پڑی۔ شدو نہ جانے کیوں مسکرا رہا تھا۔ یکا یک بیگم نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ادھر کئی دنوں سے ان کے سر میں اکثر چکّر رہتا تھا اور متلی ہوتی تھی۔ باندی نے ایک بار پھر شدو کو دیکھا۔ پھر بیگم کو دیکھا۔ تب ریاض صاحب کو دیکھا اور نہ جانے کیوں سوچنے لگی کہ شدو کو یہاں نوکر ہوئے کتنے دن ہوئے۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''صنم''، پٹنہ، بہار نمبر، جنوری تا اپریل ۱۹۵۹ء)

آخری لاش

شاہ اللہ رکھو نے آج بہت ہی تھکاوٹ محسوس کی۔ اس نے جھریوں سے بھرے اور گرد سے اَٹے چہرے کو میلے کرتے سے پونچھتے حمیدہ کو آواز دی۔

حمیدہ کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ گئی۔ اس نے اپنے باپ سے روپے لئے اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ شاہ اللہ رکھو اپنی صحت مند بیٹی کو زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ اس نے نظریں پھیر لیں۔ یکا یک اسے پھر اپنے جسم کی تھکاوٹ کا احساس ہوا اور معاً اس کا دھیان اپنے سراپا پر گیا۔ کبھی کا کسرتی بدن جہاں تہاں سے خم کھا گیا تھا۔ چوڑا چکلا سینہ اب محض ہڈیوں کا پنجر اور مضبوط ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ شاہ اللہ رکھو نے یکبارگی یہ محسوس کیا کہ وہ اب بہت بوڑھا، کمزور اور لاغر ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سی قبریں گھوم گئیں۔

خام قبریں۔

پختہ قبریں۔

وہ بوسیدہ سی ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھتے ہوئے ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ بچپن اور جوانی کی دلکش اور رنگین یادوں کے بعد ہی اس کے ذہن میں قبروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے حساب لگایا کہ وہ آج چالیس سال سے موت کے بھیانک رقص میں شریک ہے۔ قبرستان کی زمین ہی میں اس کی کارگزاریاں دفن ہیں۔ وہ آج تک قبریں کھودتا رہا ہے۔ اسے گورکنی ورثہ میں ملی تھی اور آبا و اجداد کے اس پیشے کو وہ بحسن و خوبی انجام دیتا آ رہا ہے۔ پھر اسے اپنے والدین یاد آئے۔ کتنے عرصے سے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ چاہتا ہے کہ ان کی خام قبریں پختہ ہو جائیں پھر گھر کے اخراجات آڑے آ جاتے ہیں۔ حیف اس بے چارگی پر۔

شاہ اللہ رکھو کے ذہن کے کسی گوشے سے ایک پرانی آواز ابھری۔ جب اس کی بیوی حیات تھی تو وہ کتنی آس لگائے بیٹھا تھا کہ اللہ اسے چاند سا بیٹا دے گا۔ لیکن یہ آرزو پوری ہونے سے پہلے ہی وہ خود اللہ کو پیاری ہو گئی۔ سوچتے سوچتے شاہ اللہ رکھو کا ذہن بھٹک سا گیا۔ پھر حمیدہ کی

زندگی پر آ کر ٹھہر گیا۔

اب زمانے کا کیسا چلن ہے۔ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ محض جہیز کے سامان سے کام نہیں چلتا۔ نقد رقم لڑکے والوں کو دینی پڑتی ہے۔ حمو کیسی پیاری اور سنجیدہ لڑکی ہے۔ کیسی تندرست اور کیسی خوبصورت، اور کیا چاہئے اس کی سسرال کے لوگوں کو۔ لیکن زمانے کے چلن کو کیا کہا جائے۔ سمدھی میاں شاہ رسول والے پانچ سو روپے لئے بغیر حمو کی رخصتی پر آمادہ نہیں۔ پورے تین برس ہو گئے نکاح کو۔ نہ پانچ سو روپے ہوئے نہ رخصتی ہوئی۔ شاہ محمد دین بابو تو میری حالت سے واقف ہیں۔ حمو تو ان کی شرعی بیوی ہے۔ لے جائے اسے اپنے گھر۔ لیکن کاہے کو۔ وہی رقم کی ضد! بیچاری حمو! شاہ اللہ رکھو سوچتے سوچتے ایک دم گھبرا گیا اور پھر اپنی بیٹی کو پکارا—

''حمو بیٹی! ذرا ڈبہ تو لانا، پیسے گن تو لوں۔ آخر اب پانچ سو روپے میں کتنے باقی رہ گئے''۔

اور اس رات شاہ اللہ رکھو دیر تک نہ سو سکا۔ اب پورے تین سو اسّی روپے اس کے پاس تھے۔ پانچ سو روپوں کی منزل کچھ بہت دور نہ تھی۔ بس دس بارہ قبروں کی کھدائی سے کام چل سکتا تھا۔ اس کے دل کے ایک گوشے میں یکا یک ایک خواہش ابھری کہ یہ دس قبریں ابھی ابھی کھد جائیں۔ اس خیال کے ساتھ اس کے ضمیر کو ایک چوٹ سی لگی۔ اتنی قبریں تو اتنے آدمیوں کی موت کے بعد ہی بن سکتی ہیں۔ لیکن حمو کے ہاتھوں کی مہندی کی بیل تو یہی قبریں ہیں۔ پھر شاہ اللہ رکھو کو نیند آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ دروازے پر گھٹیا چمار کی ٹولی شہنائی بجا رہی ہے۔ گورکنوں کی پوری آبادی چٹائی پر بیٹھی حمو کی برات کا انتظار کر رہی ہے۔ جوان، بوڑھی عورتیں ڈھولک پر گیت گا رہی ہیں۔ اس کے بعد برات بھی آ گئی۔ شاہ اللہ رکھو نے جلدی سے پانچ سو روپے سمدھی میاں شاہ رسول کے ہاتھ پر گن دیئے اور اب بیٹی رخصت ہونے لگی۔ اچانک اس مسرت کے عالم میں ایک کسک سی اس کے دل میں محسوس ہوئی۔ بیٹی کا بوجھ تو ہلکا ہو رہا تھا، سینے پر رکھی بلّی تو اٹھ رہی تھی، لیکن گھر محض حمو کی وجہ سے آباد تھا۔ وہ اس کی رخصتی کے ساتھ اُجاڑ ہو رہا تھا، ویران ہو رہا تھا۔ شاہ اللہ رکھو نے دیکھا کہ بیٹی رخصت ہوتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں پہلے تو نم ہوئیں، پھر وہ جذباتی ہو گیا۔ بالکل جذباتی! اور حمو کو ضروری نصیحتیں کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ بچوں کی طرح بلک پڑا۔ پھر زور زور سے رونے لگا۔ روتے روتے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے دیکھا وہ چٹائی پر پڑا خوابوں کی دنیا میں ہے۔ اس نے توبہ

استغفار کیا۔ لیکن وہ اپنے خیالات کو جھٹک نہ سکا اور حمو کی رخصتی کے بارے میں سوچنے لگا۔

گرمی کے دنوں میں تو شہروں میں ہیضہ پھیلتا ہی ہے۔ کیا اس سال ایسا نہ ہوگا؟ لیکن ہیضہ ایک بھیانک بلا ہے۔ کتنوں کے گھر اجڑ جاتے ہیں، کتنوں کی مانگ کا سندور مٹ جاتا ہے۔ نہیں ایسا نہ ہو تو اچھا ہے، لیکن ایسا ہو جائے تو حمو کی رخصتی ہو جائے۔ پھر شاہ اللہ رکھو کو گہری نیند آ گئی۔

اور ہوا یہ کہ شہر میں ہیضہ کی وبا پھیل بھی گئی۔ شاہ اللہ رکھو اپنے برے خیالات پر خفیف ہو رہا تھا۔ لیکن ایک دن میں تین موتیں ہو گئیں اور اسے ایک ہی دن میں تیس روپے مل گئے۔ شاہ اللہ رکھو کی مسرت میں غم کا ایسا امتزاج تھا کہ نہ وہ خوش تھا نہ غمگین۔ لاشیں اسے غمگین بناتیں اور روپوں کی جھنکار میں اسے شہنائی کی گونج سنائی دیتی۔ اور اس طرح وہ غم و انبساط کے دوراہے سے گزر رہا تھا۔ اس کے پاس اب چار سو نوے روپے تھے اور اس رات، رات بھر نہ سو سکا۔ صرف دس روپے کی ضرورت تھی۔ ایک لاش کی بات تھی۔

پھر صبح ہو گئی۔

ایک جنازہ دور سے جھلک گیا۔

شاہ اللہ رکھو ایک جھٹکے سے گھر کے اندر داخل ہو گیا اور حمو کو بڑے جذباتی انداز میں پیار سے دیکھ کر کہا—

''بیٹی! تیرے برے دن دور ہوئے۔ تیری برات اب آ ہی چلی''۔ حمو کچھ نہ سمجھ سکی۔

شاہ اللہ رکھو نے اپنے کدال پھاوڑے کو سنبھالا اور باہر نکل آیا۔

جنازہ قریب آ گیا تھا۔

بالکل قریب!

اس کے سمدھی میاں شاہ رسول ایک چیخ کے ساتھ اس کے گلے سے لپٹ گئے۔ شاہ اللہ رکھو کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کدالی اور پھاوڑے زمین پر گر پڑے۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء)

چراغ پرانا، شمع نئی

جنت نانی آج پھر نیلوفر پر برس پڑیں ''دھرتی پھٹ جائے اور ہم سما جائیں، ہائے یہ کیسا زمانہ آیا۔ جوان لڑکی اور تن بدن کا ہوش نہیں۔ جی چاہتا ہے زہر کھا جائیں یا اس نگوڑی نلوا کو گھاٹی دے دیں۔ جوانی ہے کہ کمبخت کے انگ انگ میں گھس گئی ہے اور اس کو ذرا برابر ہوش نہیں۔ یا معبود..... یا اللہ''۔

جنت نانی ابھی نہ جانے کیا کیا صلواتیں سناتیں کہ صمد نانا آ گئے۔ صمد نانا کے آتے ہی جنت نانی نے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے پلّو ٹھیک کیا اور کعبہ رو ہو کر تسبیح کے دانوں کو اِدھر اُدھر گھمانے لگیں۔ نیلوفر بیچاری کا قصور بس اتنا تھا کہ رحمتوا کے سامنے دوپٹہ اس کے سینے سے ڈھلک گیا۔ دراصل نائیلن کے دوپٹے کو بدن سے چپکائے رہنا نیلوفر کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ ذرا طبیعت کی چنچل تھی، تیز بولتی تھی اور تیز چلتی تھی۔ ایسے میں بدن کے کپڑوں کا اِدھر اُدھر ہو جانا کوئی اہم بات تو نہ تھی۔ دوپٹہ اگر سینے سے ڈھلک ہی گیا تو کیا ہوا؟ لیکن رحمتوا سامنے کھڑا تھا۔ بلا سے گھر کا پلانو کر تھا، تھا تو مرد اور اس پر ہٹا کٹا جوان۔ دوپٹہ سرکتے ہی نیلوفر کا جوان جسم ایک دم سے جنت نانی کے سامنے آ گیا۔ جنت نانی کٹ ہی تو گئیں۔ جیسے لڑکی رحمتوا کے سامنے ننگی ہو گئی ہو۔ اب جنت نانی چپ کا ہے کو رہتیں۔ نیلوفر کی شامت آنی تھی سو آ گئی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ صمد نانا موقع پر آ گئے اور نیلوفر کو نجات مل گئی ورنہ یہ کوسنا پیٹنا ابھی گھنٹوں چلتا۔

''کیوں بچی پر برستی رہتی ہو..... کیا کیا نیلوفر نے؟'' صمد نانا نے جنت نانی کی باتیں سن لی تھیں شاید۔

اور جنت نانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صمد نانا وضو کے لئے پانی لے کر باہر چلے گئے اور جنت نانی کچھ سوچنے لگیں۔ ان کے سامنے کئی تصویریں ابھریں، ڈوبیں، پھر ابھریں، پھر ڈوبیں۔ تسبیح کے دانے جلد جلد اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ اس دوران جنت نانی نے کتنی ہی منزلیں طے کیں، کتنے دھندلے راستے انہیں ملے، کتنے نشیب و فراز سے گذریں۔ پچاس سال کی منزلیں

چند لمحوں میں طے ہو گئیں۔

جِنو!

''جی''

''صبح ہو گئی''۔

''نماز؟''

''پڑھ لی''.....اُف، اماں بھی کیا ہیں، خواہ مخواہ ستاتی ہیں۔ سویرے تو میں خود ہی اٹھ جاتی ہوں۔ یاد نہیں کہ کبھی ایک وقت کی بھی نماز قضا کی ہو۔ اس پر صبح اور شام ''یہ'' اور ''وہ''۔ میری عمر ہی کیا ہے ابھی۔ اس پر یہ اتنا سب کچھ کرنا، نماز پڑھنا، تلاوت کتنا اچھا لگتا ہے۔ قل ہو اللہ پڑھنا۔ خصوصاً یہاں پہنچنا ص.ص.صمد اور کتنے شریر ہیں یہ۔

''جِنو؟''

''ہوں''

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''جنت النساء''

''اور میرا پورا نام؟''

''عبدالصمد''

''میرا نام کیوں لیا تم نے؟''

''کیوں نہ لیں ہم''

''تم ایکدم جنوں ہو جنوں۔ ایکدم بچی''۔

اور مجھے آج رات نیند کیوں نہیں آئی۔ میری عمر تیرہ سال ہی کی تو ہے۔ تو کیا میں بچی نہیں ہوں؟ مجھے قل ہو اللہ پڑھنا کیوں اتنا اچھا لگتا ہے۔ اور.....

اور.....

چار سال بعد۔

''جنوں''

''ہوں''

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''جاؤ نہیں بتاتی''۔

''بتاؤ بھی''۔

''نہیں، نہیں، نہیں''۔

''میرا نام بتاؤ گی تم!''

''ایکدم نہیں''۔

''کیوں؟''

''میں نہیں جانتی''۔

''ایک بات اور''

''کون سی بات!''

''تم قل ہواللہ اس قدر کیوں پڑھتی ہو؟''

''تم بڑے شریر ہو''۔

''اور تم اب بڑی ہوگئی ہو جنوں''۔

.....عید آئی، پھر عید آئی۔ پھر عید آئی، تین سال بعد۔

''یہ آم کھاؤ''۔

''نہیں کھاتی''۔

''کھانا پڑے گا''۔

''نہیں کھاؤں گی''۔

''کھاتی ہو کہ نہیں؟''

''نہیں کھاتی، نہیں کھاتی، نہیں کھاتی''۔

''نہیں کھاتی.....اَب تو کھاؤ گی''

''اوئی ماں، میرے بال چھوڑ دو.....چھوڑ دو''۔

''یہ کیا کر رہے ہو صمد.....؟ اور تو جنوں!.....کمبخت جوان ہوگئی ہے اور یہ بچوں کا کھیل۔ ہائے کیسا زمانہ ہے یہ۔ اور تم صمد سن لو۔ اب تمہارا جنوں کے ساتھ اس طرح ملنا جلنا ٹھیک نہیں۔ جنوں اب تم سے پردہ کرے گی۔ چلو چلو، گھر چلو۔ یہ اماں اس وقت کہاں سے آدھمکیں۔

''کھالو کھانا''۔

''مجھے بھوک نہیں''۔

''بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہوئی''۔

بحث مت کرو، اٹھو کھاؤ.....اور رات گئے.....وہی آم والی بات.....اب کھاؤ۔ کھا لو.....اوئی میں مری.....چھوڑ دو میرے بال۔ چھوڑ دو.....چھوڑ دو۔ ارے یہ کیا بک رہی ہے جنوں۔ ڈر گئی خواب میں، میری بچی۔ لاحول.....لاحول.....لاحول پڑھو۔ اماں نے مجھے جگا دیا ورنہ میرا دم ہی گھٹ جاتا۔

چھی.....چھی.....چھی.....کتنی خراب بات اماں سے سن رہی ہوں۔ یہ دل ہے کہ دھڑکا ہی جا رہا ہے۔ اماں ابا سے کہہ رہی ہیں.....''اب جنوں کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں تو اچھا ہے۔ صمد اپنے خاندان کا لڑکا ہے، اپنے جیسا زمیندار بھی ہے، کمی کا ہے کی ہے۔ اس کے یہاں آرام ہی آرام ہے۔ جنوں لاڈ سے پلی ہے اور لاڈ ہی میں زندگی بھر رہے گی۔ اب تم ذرا اس کی طرف سے فکر کرو۔ اور ہاں دیکھو نا، جب سے صمد کا پردہ ہوا ہے جنوں سے، جنوں نے تو کھانا تک چھوڑ دیا ہے''۔

اور پھر بارات کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

''کھا لو بیٹی''۔

''مجھے بھوک نہیں ہے''۔

''اب کھا بھی لو۔ کیا ایکدم سے سوکھ جانے کا ارادہ ہے؟''

''اماں مجھے بھوک نہیں ہے''۔

''کیا زبردستی ہے، ابھی تو برات کو پورے پندرہ دن ہیں۔ ابھی سے کھانا پینا چھوڑ دیا''۔

.....''کیا سوچ رہی ہو نانی''۔ نیلوفر نانی کو منانے آ گئی۔

جنت نانی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ پچاس سال کی منزلیں طے کر کے واپس آ گئیں۔

''کچھ.....کچھ.....کچھ.....کچھ نہیں'' جنت نانی نے کہا۔ جیسے کسی نے ان کی چوری پکڑ لی ہو۔ ''جاؤ جاؤ اپنا کام کرو.....ذرا ہوش.....ہاں ذرا ہوش رکھو۔ جوان، جوان، جوان ہو گئی ہو نا''۔

اور صمد نانا پھر آ گئے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی.....''ارے کیا جوان جوان بکتی ہو۔ ذرا سی بچی تو ہے اور تم اسے''۔

''ہاں ذرا سی بچی تو ہے ابھی تک تمہارے آگے''۔ جنت نانی نیلوفر کو بچہ سمجھنے پر ایکدم آمادہ نہیں تھیں۔

''نہیں، تمہاری طرح بوڑھی ہوگئی''۔صمد نانا نے چٹکی لی۔

''نہیں تمہاری طرح جوان ہے''۔جنت نانی نے صمد نانا کو بھی بوڑھا ثابت کرنا چاہا۔

''اچھا، مان لیا نیلو جوان ہوگئی، تو تم ہی کہو اب کیا کیا جائے''۔صمد نانا جیسے مات کھا گئے۔

''کیا کیا جائے؟.....زمانہ خراب ہے، میں چاہتی ہوں کہ اب تم اس کی طرف سے فکر کرو۔محض حقہ گڑگڑانے سے کام نہیں چلے گا''۔جنت نانی کو صمد نانا کے حقے سے ہمیشہ چڑ تھی۔

''میں تو کہتا ہوں، کردو شریف سے شادی۔لڑکا بی.اے ہے، سلیقے کا بھی ہے۔دو ڈھائی سو ماہوار کما بھی لیتا ہے۔پھر اس کی طرف سے بات چلائی گئی ہے''۔صمد نانا نے شریف کی طرف سے وکالت کی۔

''تمہاری تو عقل چرنے گئی ہے۔شریف سے بھلا نیلو کا کیا جوڑ.....ہٹئے ہٹئے۔اب تمہیں کچھ اونچ نیچ کا بھی خیال نہیں.....توبہ ہے''۔جنت نانی تقریباً غصہ ہوگئیں۔

''تم اونچ نیچ کی بات کرتی ہو.....پھر یہ بھی کہتی ہو کہ لڑکی جوان ہوگئی شادی کردو اس کی۔تو لڑکا اب آئے کہاں سے۔بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینا ہی چاہئے''۔صمد نانا نے جنت نانی کو بات سمجھانی چاہی۔

''کیا دنیا کے سارے لڑکوں کو زمین نگل گئی۔آخر اپنے افتخار میں کون سے کیڑے ہیں۔بیچارہ ایک بار آئی.اے میں فیل ہوگیا تو کیا ہوا، اس بار تو ضرور پاس کر جائے گا''۔جنت نانی افتخار کے حق میں تھیں۔

''تم ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔مجھ سے نہ جایا جائے گا۔اچھے کے یہاں برابری تھی تو برادری تھی۔اب ہم غریب ہوگئے۔زمینداری کی بس بو باس ہی رہ گئی ہے۔تم جانتی ہو کہ ہمارے پاس نقدی نہیں ہے اور اچھے کا دماغ آسمان پر ہے۔مجھے ایک ملاقات پر انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی پر بیٹی والوں سے پورے دس ہزار کی رقم لیں گے۔

''دس ہزار؟''جنت نانی تعجب کے اتھاہ سمندر میں غرق ہوگئیں۔

''.....اور لڑکا نہ جانے آئی.اے کرتا ہے کہ نہیں۔آخر شریف میں کیا برائی ہے۔افتخار سے ہر طرح اچھا ہے۔صرف اسی لئے کہ اس کے دادا حویلی کا حساب لکھتے تھے اس لئے یہ ہمارے یہاں شادی نہیں کرسکتا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟''صمد نانا نئی روشنی کے آدمی تھے۔

جنت نانی ہونے کو تو چپ ہوگئیں، لیکن ان کا دل ہرگز قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ

شریف نیلوفر کا شوہر بنے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک نوکر کی اولاد گھر کا داماد بنے۔

اور اس دن کے واقعہ سے تو جنت نانی کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ افتخار کسی طرح صمد نانا کے یہاں آ گئے تھے۔ صمد نانا نے جنت نانی کو یہ بات بتادی اور کواڑ کی اوٹ سے ساری باتیں سن لینے کو کہا۔

''بیٹا تم کیا پڑھ رہے ہو؟'' صمد نانا نے افتخار سے پوچھا۔

''آئی۔اے میں ہوں، بی۔اے کرتے ہی باہر جانے کا خیال ہے''۔ افتخار نے بتایا۔

''باہر، یعنی ولایت جاؤ گے تم۔'' صمد نانا نے وضاحت چاہی۔

''ہاں، لندن ہی جانے کا ارادہ ہے''۔ افتخار نے بات سمجھادی۔

''کب جاؤ گے؟''

''شادی کے بعد''۔

''یہ کیوں.....؟''

''تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ پورے پندرہ ہزار سسرال سے لوں گا۔ آخر پڑھ کاہے کو رہا ہوں؟'' افتخار نے پڑھنے کا مقصد بتادیا۔

قریب تھا کہ جنت نانی کو غش آ جاتا لیکن انہوں نے ٹھیک اسی وقت دیکھ لیا کہ نیلوفر دوسرے کواڑ کے اوٹ سے لگی ساری باتیں سن رہی ہے اور اس بار پھر سینہ سے آنچل ڈھلکا ہوا ہے۔

جنت نانی کو ایسا لگا جیسے اب نیلوفر کا معاملہ فوراً طے کر دینا چاہئے ورنہ..... ورنہ کیا ہو، کون جانتا ہے۔

''تو سن لیا نا اپنے افتخار کی باتیں''۔ صمد نانا بولے۔

اور جنت نانی چپ رہیں۔ جیسے ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہا ہو۔

صمد نانا پھر بولے — ''اب دکھاؤں شریف کیسا ہے۔ اپنی ڈیوڑھی کے منشی کے خاندان کا لڑکا''..... اور جنت نانی اس سوال پر بھی خاموش ہی رہیں۔

ایک ہفتہ بعد صمد نے شریف کو بلوا بھیجا۔ شریف سے جنت نانی کا پردہ نہیں تھا۔ گھر کے ملازم کے پوتے سے پردہ کا سوال ہی کہاں اٹھتا تھا۔

''کیسے ہو بیٹا؟''

''آپ کی دعا ہے''۔

''کیا کرتے ہو؟''

''جی ایک فرم 'کالٹکس' میں ملازم ہوں''۔

''کیا مل جاتا ہے؟''

''اللہ کا احسان ہے، بس خوش ہوں''۔

''تین سو روپے تو ملتے ہی ہوں گے؟''

''جی ہاں، چار سو کے قریب مل ہی جاتا ہے۔''

''ماشاءاللہ!''

''شکریہ!''

''شادی کب کرو گے بیٹا؟''

''جب ہو جائے''۔

''تمہیں میرے یہاں کا رشتہ واقعی پسند ہے؟''

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں مجھے''۔

''ہم لوگوں کی موجودہ حالت سے تم واقف ہو''۔

''بہت حد تک''۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ہماری چھوٹی حویلی کب کی بک گئی ہے''۔

''جی ہاں''۔

''مقروض بھی ہوں''۔

''میں آگاہ ہوں''۔

''ہمارے یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا بیٹا''۔

''مجھے کچھ چاہئے بھی نہیں!'' صمد نانا جذبات پر قابو نہ پا سکے اور شریف کو گلے سے لگا لیا۔ جنت نانی کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں، گلوگیر آواز میں بولیں — ''بیٹا! میں کل ہی تمہارے یہاں آ کر تاریخ مقرر کر لوں گی''۔

''مہربانی آپ کی''.....اور شریف چلا گیا اور صمد نانا بھی باہر چلے گئے۔ جنت نانی نے نیلوفر کو بڑے پیار سے پکارا۔

''نیلو، آؤ بیٹی نیلو.....میرے پاس آؤ''۔

نیلوفر شرماتی لجاتی جنت نانی کے پاس آئی۔ اب کے اس کے سینہ پر نائیلن کا دوپٹہ نہیں تھا۔ سادہ سے کپڑے کی اوڑھنی تھی جسے وہ اچھی طرح اپنے بدن سے لپیٹے ہوئی تھی جس کے سرکنے کا ذرہ برابر بھی اندیشہ نہیں تھا۔

جنت نانی نے دل ہی دل میں سوچا..... میری بات پکی ہوئی تھی تو میں نے کھانا چھوڑ دیا تھا، نیلو کی بات پکی ہو رہی ہے تو اس نے سادہ دوپٹہ اوڑھ لیا ہے۔ پتہ نہیں آج کھانا بھی کھاتی ہے کہ نہیں..... زمانہ بدلنے کے بعد بھی کتنا ایک جیسا ہے۔

(مطبوعہ: ''اشارہ''، پٹنہ، جنوری-فروری ۱۹۶۰ء)

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

گرگٹ کے خطوط

گل صحرا، پٹنہ-۴
یکم جون ۱۹۶۳ء

خستشمی کرشن چندر صاحب!

کورنش بجالاتا ہوں۔

ابھی ابھی آپ کی کہانی ''ہمالیہ کے سائے میں'' میں نے پڑھی۔ کہانی کا ہے کو ہے، ایک شاہکار ہے۔ آپ کو بجا طور پر ایشیا کا عظیم افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں مبالغے کا قائل نہیں۔ خواہ مخواہ کی تعریف وتوصیف بھی میری عادت نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بہترین ادب کے دو چار افسانہ نگاروں میں آپ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ آپ اردو کی کہانیوں کی آبرو ہیں۔ آپ کی واحد ذات نے اردو کو وہ عزت اور توقیر بخشی ہے جو متقدمین سے متاخرین تک کی مجموعی کوششیں نہ کر سکیں۔ چین کے جارحانہ اقدام کو فنکارانہ طور پر کہانی کا روپ دے کر آپ نے اعلیٰ اور زندہ ادب بنا دیا ہے۔ آپ نے واقعی یہ ثابت کر دیا ہے کہ موضوع بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل شئے ٹریٹمنٹ ہے۔ تقابل خطرناک بات ہے۔ پر میں یہ کہوں گا کہ راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس یا یہاں کے اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی آپ کے گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ بھلا آپ کے نام کے ساتھ ان معمولی افسانہ نگاروں کے نام کیسے لئے جا سکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ لیکن میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔ اسی باعث اتنا کچھ لکھ گیا۔ گو کہ جانتا ہوں کہ ان افسانہ نگاروں میں کئی آپ کے دوست بھی ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ بحیثیت افسانہ نگار میرا نام آپ تک نہیں پہنچا ہوگا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں چار سال سے کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ چینی حملے سے میں بھی متاثر ہوا تھا۔ ایک کہانی ''دار اور رخسار'' اسی پس منظر میں ہو گئی تھی۔ ایک مقامی رسالہ ''کنائے'' میں چھپی بھی تھی۔ اس سلسلہ میں

اگر آپ اپنی رائے (چند جملوں میں سہی) بھیج دیں تو آپ کا کرم ہو اور میں تا زندگی آپ کا ممنون رہوں۔ کہانی منسلک ہے۔

احقر
وحشی عظیم آبادی

• • •

گل صحرا، پٹنہ-۴
یکم جون ۱۹۶۳ء

مکرمی بیدی صاحب!
جے گرنتھ

آپ کی کہانی ''ٹرمینس سے پرے'' باصرہ نواز ہوئی۔ میں آپ کے فن کا عرصہ سے قائل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کہانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھتا ہوں۔ آپ کی کم نویسی ہم پرستاروں پر بڑا ظلم ڈھاتی ہے۔ لیکن آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ اعلیٰ اور زندہ ادب غور و خوض کے بعد ہی سنبھل سنبھل کر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ آپ کی کہانیوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو کرشن چندر کی زود نویسی کے باعث ان کی کہانیوں کا ہو رہا ہے۔ کیا اس میں اب شبہ رہ گیا ہے کہ آپ ہی ایشیا کے سب سے بڑے کہانی کار ہیں۔ آپ اسے تحسین ناشناس نہ تصور کریں تو میں یہاں تک کہوں گا کہ آپ دنیا کے دو تین عظیم ترین افسانہ نگاروں کی صف میں ہیں۔ آپ نے اردو کو اپنی کاوشوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ ایک ''ٹرمینس سے پرے'' ہی کو لے لیجئے۔ راکھی کے روایتی روحانی تقدس پر کیسی کیسی دھیمی دھیمی آنچ آتی ہے۔ حق ہے کہ سگی بہن اور راکھی والی بہن کا فرق زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عنوان میں جو جدت ہے، وہ غور طلب ہے۔

آپ ہنگامی موضوعات پر کہانی نہیں لکھتے۔ یہ بڑا سوچا سمجھا موقف ہے۔ بھلا ہر ادنیٰ موضوع کیسے کہانی بن سکتا ہے (مگر کرشن جی کو کون سمجھائے)۔

کہانی کار کی حیثیت سے میرا نام آپ کے لئے نیا سہی، لیکن میں کئی برسوں سے کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ ایک مطبوعہ کہانی ''چکر میں ہے یہ زمین'' ملفوف ہے۔ ازراہِ کرم اس کہانی کے

بارے میں چند سطریں لکھ بھیجئے۔ میں تاحیات آپ کا شکر گذار رہوں گا۔

کمترین
وحشی عظیم آبادی

• • •

گل صحرا، پٹنہ-۴
یکم جون ۱۹۶۳ء

محترم خولجہ صاحب!

لال سلام

مزاجِ اقدس؟ آپ کی کہانی ''لہو پکارے گا'' نظر نواز ہوئی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک بہت بڑا صحافی، ایک بہت بڑا ادیب بھی کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ کی شخصیت میں جو تہہ داری اور لچک ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی صحافتی مصروفیت اور ہنگامی زندگی چاول پر ''قل ہواللہ'' لکھنے کی اجازت کیسے دیتی ہے۔ میں ان پڑھ سہی، پر ببانگ دہل کہوں گا کہ آپ کی کہانیوں میں زندگی کی جو مہک ہوتی ہے وہ کرشن اور بیدی کے یہاں معدوم ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ کل کا نقاد یہی فیصلہ صادر کرے گا کہ آپ دنیا کے بہترین افسانہ نگاروں میں ایک ہیں۔ مقابلہ مقصود نہیں۔ پر آپ ہی بتایئے کہ آپ کے سوا ایشیا کا کون افسانہ نگار ہے جو صحافت کو ادب میں اس طرح مدغم کر دے کہ دونوں ایک دوسرے کے جزو لاینفک بن جائیں۔ سچ ہے کہ سچا ادب، سچی شاعری اور سچی کہانی وہی ہے جو عوامی ہے۔ مجھے یہ کہہ دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ آپ کا منفرد رنگ کرشن اور بیدی کے مقابلہ میں ہر طرح ممتاز ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ آپ مجھے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے نہیں جانتے ہوں گے۔ لیکن میں کئی برس سے کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ ایک چھپی ہوئی کہانی ''مرثیہ کہیں جسے'' اس خط کے ساتھ نتھی ہے۔ ازراہِ کرم اسے پڑھ لیں اور دو سطور اس باب میں لکھ بھیجیں۔ میرے لئے آپ کی تحریر سند کا کام کرے گی۔ میں عمر بھر آپ کی نوازش کے بوجھ تلے دبا رہوں گا۔

خاکسار
وحشی عظیم آبادی

• • •

گل صحرا، پٹنہ-۴

یکم جون ۱۹۶۳ء

مخدومی ومکرمی اختر اورینوی صاحب!

دام الطافکم

مزاج شریف قبلہ وکعبہ؟

میں نے فوراً آپ کی کہانی ''ہیلی پیڈ'' پڑھ کے ختم کی ہے۔اس سے پہلے اسی موضوع پر کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کی کہانیاں زہر مار کر چکا ہوں۔ان کی کہانیاں ''ہمالہ کے سائے میں'' اور ''لہو پکارے گا'' پڑھ کر بے حد مکدر ہوا تھا۔''ہیلی پیڈ'' نے بڑا ریلیف کا کام کیا۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کرشن اور خواجہ کی شہرت کے اسباب کیا ہیں اور انہیں کس جہت سے افسانہ نگار ہونے کا سرٹیفکیٹ ملا ہے؟ اُوٹ پٹانگ کچھ لکھ دینا ہی کہانی نہیں ہے۔چین کے جارحانہ اقدام نے ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔بھلا ''ہمالہ کے سائے میں'' بھی کوئی کہانی ہوئی۔نہ کوئی زندہ کردار، نہ ہی واضح پلاٹ۔کھردرا اسلوب۔لعنت ہے ان پر جو ایسے افسانہ نگار کو ایشیا کا بڑا افسانہ نگار مانتے ہیں اور خواجہ صاحب بھی خوب ہیں کہ خود کو پانچ سواروں میں گنتے ہیں۔بھلا صحافت کا ادب سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔کہانی لکھنا چاول پر آیت کریمہ لکھنے کا فن ہے اور صحافت بل چلانا ہے۔ایسے میں ان کی کہانی ''لہو پکارے گا'' پڑھ کر مجھے جو تکدر ہوا، وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔پر ''ہیلی پیڈ'' نے موڈ سازگار کیا۔آپ نے واقعی موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔خدا گواہ ہے جو پیتھوس اس کہانی میں مجھے نصیب ہوا، کم کہانیوں میں ملا ہے۔بے شک آپ کی یہ کہانی آپ کو ایشیا کے (بلکہ دنیا کے) چند گنے چنے افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔آپ واقعی امر ہو گئے ہیں۔کسی حد تک میں بیدی کے فن کا قائل تھا۔لیکن آپ کی جاوداں کہانیوں کے آگے ان کا فن بھی طفلانہ معلوم ہونے لگا ہے۔

ہاں، خوب یاد آیا۔آپ کے دوست سہیل عظیم آبادی بھی خیر سے افسانہ نگار ہی ہیں۔کل ان کی کہانی ''عجائب خان'' پڑھی۔کہنے کو تو یہ کہانی ہے لیکن سچ پوچھئے تو دنیا کا نیا عجوبہ ہے۔چلے تھے صاحب اردو افسانے کو ایک نیا کردار دینے اور کر گئے رطب ویابس میں اضافہ۔ان سے کہئے کہ پہلے قاعدہ بغدادی اور اردو کی پہلی کتاب کی منزل سے آگے بڑھیں۔توبہ ان کی زبان، پانچویں درجے کے طالب علم کی زبان ہے۔بس یہی کہ نہر پر چل رہی ہے پن چکی۔ذرا انشاء میں زور تو ہو۔کچھ جوشیلے، بھڑکیلے الفاظ تو ہوں۔کچھ زبان میں رنگ وروغن کی کیفیت تو ہو۔یہ کیا کہ

سامنے کے پٹے پٹائے معمولی الفاظ لئے اور کہانی لکھ دی۔ گویا کہانی لکھنی نہ ہوئی، گھوڑے پر مضمون لکھنا ہوا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ سہیل صاحب افسانہ نویسی ترک کر کے کسی مدرسے کے مولوی ہو جاتے۔ بتایئے تو آج جب کہ ''ہیلی پیڈ'' جیسی لافانی کہانی لکھی جا رہی ہے تو پھر ''عجائب خاں'' کی کھپت کہاں ہوگی۔ ان کا فن تو بقول شخصے ''رام بھروسے آنکھ ملتے اٹھا'' کی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ حضرت بے حد بور کرتے ہیں اور اپنا رشتہ پریم چند سے جوڑتے ہیں۔ لیکن چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

شاید آپ کے علم میں ہو کہ میں بھی دس بیس کہانیاں تین چار برسوں میں لکھ چکا ہوں۔ ایک تازہ کہانی (جو پٹنہ ریڈیو سے براڈ کاسٹ بھی ہوئی ہے) ''ایک اینٹ - ایک پتھر'' بھیج رہا ہوں۔ آپ کا احسان ہوگا اگر آپ اپنی قیمتی رائے اس کہانی کے بارے میں لکھ بھیجیں۔

بے مایہ
وحشی عظیم آبادی

• • •

گل صحرا، پٹنہ-۴
یکم جون ۱۹۶۳ء

جناب سہیل صاحب

آداب!

ابھی ابھی آپ کی کہانی ''عجائب خاں'' پڑھی ہے۔ یوں تو آج کل کہانی کاروں کی بھیڑ چال ہے۔ لیکن آپ کا ممتاز، منفرد رنگ کسی کور چشم سے ہی اوجھل رہ سکتا ہے۔ کہنے کو تو کرشن چندر بھی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ حضرت شاعری کرتے تو زیادہ مناسب بات ہوتی۔ ان کے یہاں پلاٹ میں جو ناہمواری رہتی ہے، وہ مجھے بے حد کھٹکتی ہے۔ خواہ مخواہ کی بکواس ان کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کی کہانیوں کا کوئی کردار بھی جاوداں نہیں بن سکا۔ دراصل کسی کیریکٹر کے خدوخال کو اجاگر کرنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔

اور بیدی کے یہاں اگر پلاٹ کی ہمواری ہے تو بیان کا کھردراپن بھی ہے۔ انہوں نے شاید عزم کر لیا ہے کہ اردو کو پنجابی بنا کر ہی دم لیں گے۔ پھر ان کی دور از کار تلمیحات طبیعت کو منغص کر دیتی ہیں۔ ان کا اسلوب سڑک پر روڑے بچھانے کا اسلوب ہے۔ خواجہ صاحب پر تو

خواہ مخواہ افسانہ نگاری کا الزام ہے۔ وہ انشائیہ نگار ہوتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔ ان کی صحافت انہیں کہیں جمنے نہیں دیتی۔ انہوں نے افسانے اور مضمون کی سرحدیں ایک دوسرے میں ضم کردی ہیں۔ ان کی کہانی پڑھتے وقت اکثر کوئی روداد کا سپاٹ اور سطحی بیان معلوم ہوتا ہے۔ گویا افسانہ نویسی نہ ہوئی خبروں کی رپورٹنگ ہوئی۔ اور آپ کے اختر اور ینوی ایک الگ مصیبت ہیں۔ پوری ڈکشنری ازبر کئے بیٹھے ہیں اور ''ڈکشن'' کسے کہتے ہیں بیچارے جانتے ہی نہیں۔ اُف رے یہ اسٹائل، جیسے لکھتے ہوں ''وہ کم مایہ خاک روب چرمی جوتے، دائمی قدروں کے حامل تلاش کر رہا تھا'' یعنی بھاری بھرکم الفاظ اینٹھتے، اتراتے، چمک کرتے کردار، خواہ مخواہ کی بے ہنگم طوالت، اور ینوی کے افسانوں کے اہم عناصر ہیں۔ اب آپ ہی انہیں بتادیں کہ کہانی کاری ایک کومل اور نازک فن ہے۔ اس کے لئے لطیف جذبات اور محسوس کئے ہوئے تجربوں کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک دھیمی دھیمی پرکشش ابتدا ہوتی ہے جو اپنے کردار کے نقوش واضح کرتی ہوئی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک پراثر نقطہ عروج پر اس کا اختتام ہوجاتا ہے۔

بے شک آپ اردو کہانیوں کے ممتاز ترین اسکول ہیں۔ آپ کا دھیما دھیما لہجہ پریم چند کی روایت کی ارتقائی صورت ہے۔ آپ کا بے تکلف سادہ انداز بیان بے حد پرکشش ہے۔ آپ عوام کے لئے لکھتے ہیں اسی لئے حد درجہ آسان اور تکلف سے عاری زبان کے استعمال پر جو قدرت آپ کو ہے، وہ پریم چند کو بھی نصیب نہیں تھی۔ مجھے مبالغے سے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں شرم نہیں کہ آپ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار اور دنیا کے چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں ایک ہیں۔ اس لئے کہ ماجرا نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے مشکل فن پر آپ کا بلاشرکت غیرے قبضہ ہے۔ ایک ''عجائب خاں'' کو ہی لے لیجئے۔ کیا اس سے بہتر کہانی اردو یا کسی دوسری زبان میں لکھی گئی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میرا نام آپ کے لئے نیا ہوگا۔ لیکن میں چار سال سے مسلسل کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ ایک مطبوعہ کہانی ''کوئی غمگسار کیوں ہو'' خط کے ساتھ نتھی ہے۔ ازراہِ کرم اپنی گرانقدر رائے سے نوازیئے تاکہ مزید لکھنے کا حوصلہ ہو۔

نیاز کیش
وحشی عظیم آبادی

• • •

گل صحرا، پٹنہ

۱۶ جون ۱۹۶۳ء

مجبی زکی انور!

میری یہ شکایت مہمل ٹھہری کہ بڑے افسانہ نگار نئے لکھنے والوں کو نہیں پوچھتے۔ میری کہانیوں کا مجموعہ ''ایک نقشِ وحشی'' زیرِ ترتیب ہے۔ تمہیں یہ جان کر مسرت ہوگی (اوروں کو دکھ ہوگا) کہ اس کی اشاعت کی خبر (جو ایک رسالہ میں چھپی ہے) پڑھ کر کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ اتنے خوش ہوئے کہ میری کہانیوں کے بارے میں (بغیر میری خواہش کے) اپنی رائیں بھیجی ہیں۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ ان خود ساختہ بڑوں کی کہانیوں کو ان کے سامنے ہی کنڈیم کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان نام نہاد بڑوں کی رائیں اپنی کتاب میں شامل کروں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ ان کے احساسات مجروح ہوں گے، شامل کر رہا ہوں۔

مخلص

وحشی عظیم آبادی

(مطبوعہ: ماہنامہ ''راوی''، پٹنہ، اگست ۱۹۶۳ء)

اپنی اپنی راہ

اسمول ریڈ ہاؤس، پٹنہ-۱
یکم اپریل ۱۹۵۸ء

سیتا!

میں جانتا ہوں کہ تمہارا نام سیتا نہیں ہے۔ مجھے فلمی ستاروں سے دلچسپی رہی ہے اور اسی دلچسپی کے باعث شاید میں ہائی اسکول کے آخری امتحانات میں صرف چار بار فیل ہوا۔ صرف میں نے جان بوجھ کر لکھا ہے۔ دراصل پانچویں مرتبہ میرے ابا (خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے) نے پرزور سفارشیں پہنچائیں اور مجھے ان سفارشوں کی بدولت اچھے نمبر مل گئے۔ نتیجے کے طور پر تھرڈ ڈویژن سے نکل گیا۔ ہاں تو میں نے تمہیں سیتا کہا ہے حالانکہ میں اب بھی فلمی رسالے پڑھتا ہوں جس کے طفیل میرا جنرل نالج بڑھ گیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہارا اصل نام کسم ہے اور تمہارے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کا ناخن ہمیشہ بڑھا رہتا ہے۔ اور تمہاری بائیں ہتھیلی پر ایک تل ہے۔ اور ۱۹۳۴ء میں جس وقت دھرتی کانپ رہی تھی تم پیدا ہوئی تھیں۔ اور تم ہر روز گھوڑے کی سواری کرتی ہو۔ اور رات کا کھانا اپنے لئے خود پکانا تمہاری ہابی ہے۔ تو میں نے کہا نا کہ تمہارا نام کسم ہے۔ پھر بھی میں نے تمہیں سیتا لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ سیتا بہت پوتر نام ہے۔ اس کے پیچھے تم جانتی ہوگی کہ ایک لمبی پوتر تاریخ ہے۔ تو کسم تم بہت پوتر ہو۔ اس لئے سیتا ہو۔ آخر میں تمہیں سیتا کیوں نہ کہوں؟ مجھ جیسے معمولی آدمی سے تمہاری یہ محبت، حیرت کی بات ہے۔ میں نے کہا ہے کہ میرا جنرل نالج بہت ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم ایک خوبصورت بنگلے کی مالک بننے والی ہو اور جلد ہی تمہارے پاس جدید ماڈل کی بیوک بھی ہوگی۔ تم خوبصورت بھی ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم آج کی اداکار ہو۔ شہرت تمہاری کنیز بننے پر ہر لحہ آمادہ نظر آتی ہے۔ ایسے میں میرا تم سے کیا مقابلہ، کیا جوڑا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود تم ایک نیک چلن لڑکی ہو جس کے پہلو میں ایک حساس دھڑکتا ہوا دل بھی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے الفاظ تمہارے دل میں اتر گئے اور تم نے بہت پیار سے میری تصویر

مانگی ہے۔ اُف تمہارے الفاظ، ہر لفظ میں تمہاری شبیہ نظر آئی مجھے! تم اپنے خط میں ہنس رہی تھیں، گدگدا رہی تھیں۔ ایک پیغام دے رہی تھیں جسے میں ابتدا میں ایک کھیل سمجھا تھا۔ کسم! نہیں نہیں سیتا! مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب میں نے تمہاری فلم ''پیارا ہے'' دیکھی تھی۔ تم نے کس طرح ایک غریب لڑکے سے محبت کی تھی۔ ہائے رے تمہاری اداکاری۔ اب تک سارے مناظر نظروں میں سمائے ہوئے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ شو سے واپس آتے ہی میں نے تمہیں ایک محبت بھرا خط لکھ دیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ تم جواب نہیں دوگی، اسے پھاڑ کر پھینک دوگی۔ رات کو کھانا پکاتے وقت اس سے ایندھن کا کام لوگی۔ لیکن یہ محض میری بھول تھی۔ تمہارا جواب، غیر متوقع جواب! خطوط کا سلسلہ، دراز سلسلہ، اور پھر تصویر کا مطالبہ! میں تمہیں سیتا تصور کرنے پر مجبور ہوں کسم! تم فلمی دنیا کی سیتا ہو اور یہ ناممکن بھی نہیں ہے، جہاں کانٹے ہوتے ہیں وہاں پھول بھی تو ہوتے ہیں۔ اور تم ہی بتاؤ مجھے تم پر شک کرنے کا کیا حق ہے؟ اور کسم! سیتا پر کوئی شک بھی کرے تو سیتا کا کیا بگڑ جائے گا؟ میں اب یہی کہوں گا کہ تم میری سیتا ہو، بیسویں صدی کی سیتا ہو، اور اس صدی میں راون بہت سے ہیں۔ یہ تو تم جانتی ہی ہوگی۔ ہاں خوب یاد آیا، میں نے تمہاری ہدایت پر تمہارے متعلق ''فلمی جیون'' میں مضمون لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ تم تو میرے بارے میں اب سب کچھ جان چکی ہو، میں افسانے لکھتا ہوں اور صرف افسانے لکھتا ہوں۔ فلمی مضامین لکھنا میرا فیلڈ نہیں ہے۔ اس لئے صرف تم پر مضامین لکھنے کے لئے میں نے اپنا ایک اور نام رکھ لیا ہے ''پریمی''۔ تم اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی جاؤ۔ میں مضامین لکھتا جاؤں۔ اب دیر ہو رہی ہے کسم! میری سیتا! اس لئے خط یہیں ختم کرتا ہوں۔

تمہارا اپنا

پریمی

اسمول ریڈ ہاؤس، پٹنہ-۱

۱۷ جون ۱۹۵۹ء

پیاری سیتا!

ابھی ابھی میں نے تم پر اپنا تازہ مضمون مکمل کیا ہے۔ تم نے اب تک آٹھ فلموں میں کام کیا ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں تمہاری اداکاری کے سارے تیور سمیٹ لئے ہیں۔ تم خود دیکھوگی کہ تمہارے بارے میں میرے پچھلے تین مضامین یعنی کسم کی نجی زندگی، کسم کی اداکاری اور کسم کا ماضی، حال اور مستقبل، میرے اس مضمون یعنی ''کسم: آج کی بہترین ایکٹریس'' سے کس

قدر پیچھے رہ گئے ہیں۔ میں نے اپنا قلم تمہارے لئے وقف کر دیا ہے۔ نہ جانے ان مضامین سے تمہیں کچھ فائدہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ تم کچھ لکھتی بھی تو نہیں ہو۔ تم تو عجیب ہو پیاری۔ بھلا اداکار بھی شرماتی ہے؟ دیکھو تو تمہارے اس جملے میں کتنی شرم ہے۔ تم لکھتی ہو "بھگوان کے لئے کبھی یہ نہ لکھ دیجئے کہ کسی کے لئے میرا دل بھی دھڑکتا ہے"۔ کسم! میں تمہارے اس کسی کو خوب جانتا اور اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں۔ اب کے یہ ضرور لکھو کہ کنٹریکٹس کی رفتار کیا ہے۔

صرف تمہارا

پریمی

• • •

اسمول ریڈ ہاؤس، پٹنہ-۱

۱۶ اگست ۱۹۵۹ء

بہت پیاری کسم!

"کسم: آج کی بہترین ایکٹریس"، تمہیں پسند آیا اور لوگوں کو بھی۔ یہ کوئی عجیب بات تو نہیں ہوئی۔ حقائق اگر سلیقے سے عوام تک پہنچائے جائیں تو وہ انہیں ضرور پسند کریں گے۔ اسے میں اپنے قلم کا زور تو نہیں سمجھتا۔ اس میں تمہاری اپنی صلاحیت کو دخل ہے۔ ابھی ابھی رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں تمہارے بارے میں مضمون کا کوئی ٹائپک سوچ رہا تھا کہ چاند پر نظر پڑ گئی۔ آج چاند کی تیرہ تاریخ ہے۔ عجیب انداز ہے آج کے چاند کا۔ کتنی ٹھنڈک پہنچا رہا ہے چاند اور اتنی دور سے میرے کمرے میں ٹھنڈی روشنی اس طرح گھس آئی ہے کہ ہر طرف اجالا ہی اجالا ہے۔ صحن پر چاندنی کی سفید چادر بچھ گئی ہے۔ کیا بتاؤں اس وقت کیا سماں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کتنی مماثلت ہے چاند میں اور تم میں۔ چاندنی میں اور تمہارے خیال میں۔ جب چاند دیکھتا ہوں بس تمہیں دیکھتا اور جب نظریں ہٹا کر تمہارے بارے میں سوچتا ہوں، دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ جیسے اس میں چاند کی ساری چاندنی کسی دروازے سے آ سمائی ہے۔ لیکن کسم! چاند کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں داغ ہے۔ لیکن تم بے داغ ہو کسم، تم سیتا ہو۔ میں نے تمہارا نام سیتا غلط تو نہیں رکھا ہے۔ پیاری تمہاری پرچھائیں تو بہت دیکھی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اب تمہیں دیکھوں اور تمہیں چھوؤں بھی۔ دیکھو تمہارے گالوں پر حیا کی سرخ لکیریں دوڑ رہی ہیں۔

تمہارا۔ پریمی

• • •

اسمول ریڈ ہاؤس، پٹنہ-۱

۲ نومبر ۱۹۶۰ء

میری کسم!

اس بار تمہارا جواب دیر سے آیا۔ اس کی وجہ تمہارے خط نے سمجھا دی مجھے۔ اب تم حد سے زیادہ مصروف رہنے لگی ہو۔ تم اپنے نفیس بنگلے میں کچھ دیر آرام بھی نہیں کر سکتیں۔ تمہاری نئے ماڈل کی بیوک جب کبھی شہر کی شاہراہ پر نکلتی ہے، لاکھوں پروانوں کے حلقے میں آ جاتی ہے۔ تمہارے دروازے پر اب پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کی لمبی قطار لگی رہتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم بری طرح بک ہو چکی ہو۔ اس طرح ابھی دس ماہ تک کوئی نیا کنٹریکٹ کرنے سے قاصر ہو۔ اور یہ کہ پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تمہیں مس کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہ تو سب ٹھیک ہے اور بات بھی خوشی کی ہے۔ لیکن جانِ من! اپنی صحت کا تو خیال کرو۔ اب تم بہت کما چکی ہو۔ اتنے روپے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم لکھتی ہو بس جی چاہتا ہے کہ ان ہنگاموں سے الگ ہو کر آپ کے پاس چلی آؤں، اور پھر.... اور پھر کے بعد تم نے جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ اور میں نے اپنے دماغ سے وہ جگہ پر کر لی ہے۔ میری جان! اب تو تاب انتظار نہیں رہی۔ تمہارے لئے یعنی بمبئی کے لئے بہت جلد یہاں سے چل پڑوں گا۔ ہاں ''السٹریٹیڈ'' میگزین میں میرا مضمون پڑھ لینا۔ میں نے اس مضمون میں ہالی ووڈ کی ایکٹریسوں سے تمہارا مقابلہ کیا ہے۔

بہت سا پیار۔

تمہارا

پریمی

• • •

اسمول ریڈ ہاؤس، پٹنہ-۱

یکم دسمبر ۱۹۶۰ء

میری پیاری کسم!

اس بار بہت انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ میں اس خط سے کچھ پریشان سا ہو گیا ہوں۔ تم لکھتی ہو کہ میں ابھی بمبئی آنے کا قصد نہ کروں اس لئے کہ تم آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں تقریباً تین ماہ باہر ہو گی۔ پچھلے دن میں نے فلم نیوز میں پڑھا تھا کہ لکی اسٹوڈیوز میں ''چلتی گاڑی'' کی شوٹنگ ہو رہی ہے اور تقریباً تین ماہ تک مسلسل ہوتی رہے گی۔ تم اس میں ہیروئن ہو۔ اس لئے

میرے خیال میں ابھی باہر تو نہیں جانا چاہئے تمہیں۔ خیر چھوڑو، تین ماہ اور صبر کرلوں گا۔ تم نے میری بے صبری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''چند ہی روز مری جان بس اب چند ہی روز''۔ تم بڑی وہ ہو، تین ماہ کی طویل مدت کو چند روز سمجھتی ہو۔ یہاں تو ایک ایک لمحہ گزارنا محال ہو رہا ہے۔ خوب! وعدۂ وصل قیامت پر اٹھا رکھا ہے۔ خیر تمہارے لئے قیامت کا بھی انتظار کروں گا۔ تمہاری مرضی کے مطابق تمہارے ملبوسات (فرضی) کے بارے میں مضمون ضرور لکھوں گا۔

دید کا طالب ——— پریمی

• • •

اسمول ریڈ ہاؤس، پٹنہ-۱
یکم اپریل ۱۹۶۱ء

اداکار کسم!

تم سے بہت بڑی بھول ہوگئی۔ تم نے اپنی سہیلی مدھو کے نام جو خط لکھا وہ غلطی سے میرے نام پوسٹ کر دیا جو مجھے مل گیا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے نام کا خط تمہاری سہیلی کو ضرور مل گیا ہوگا۔ تم اپنی سہیلی کو لکھتی ہو ''ایک بے وقوف اور مفلس افسانہ نگار میرے دامِ محبت میں گرفتار ہے اور میرے قلم کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ مجھ پر اچھوتے مضامین نت نئے عنوان سے لکھ رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دروازے پر پروڈیوسروں کی کیو لگ گئی ہے۔ لیکن ایک مصیبت آپڑی ہے۔ وہ اپنے شہر سے میرے یہاں آنا چاہتا ہے۔ کم بخت اپنا مقام بھول رہا ہے۔ میں نے بہر حال پٹی پڑھا دی ہے۔ ہائے رے بے وقوف...!'' تو کسم تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی۔ میں کسی نہ کسی طرح فلمی قلم کار بننا چاہتا تھا اس لئے تمہیں بے وقوف بنا کر تمہارے الٹے سیدھے حالات معلوم کئے اور تم پر مضامین لکھے جو مقبول بھی ہوئے۔ میرا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ میں اب پریمی ہوں، مشہور پریمی جو فلمی دنیا میں اپنے مضامین کے باعث بہت مقبول ہو چکا ہے۔ بہت سے ایکٹروں اور ایکٹریسوں نے مجھے اپنے بارے میں لکھنے کی دعوت دی ہے۔ اب میں ان میں سے کسی ایک پر لکھنا شروع کروں گا۔ تم بھی اپنے بارے میں میرے مضامین پڑھنا۔ لیکن ان سے تمہارے دروازے پر لگی ہوئی پروڈیوسروں کی ''کیو'' ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔

صرف اپنا ——— پریمی

(مطبوعہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، ستمبر ۱۹۶۰ء)

ایک شرط، ایک امتحان

''یہ بات نہیں کہ میں محبت کا قائل نہیں۔ لیکن محبت کی چلتی پھرتی سی جو قسم ہے، اس پر میرا ایمان نہیں ہے''۔

اتنا کہہ کے ریاض چپ ہو گیا۔

''لیکن میری سنو گے بھی یا فلسفہ بگھارتے رہو گے؟'' امتیاز نے منہ بنا کے کہا۔

''تم جو کچھ کہو گے مجھے ایک حد تک معلوم ہے۔ یہی کہ انگبیں تمہیں بہت چاہتی ہے۔ تمہارے بغیر اس کی زندگی ادھوری ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں یونہی سی ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ وہ تمہیں پہلے پہل ملی کہاں؟''

امتیاز نے اتنا سنا تو اپنا جلتا ہوا سگریٹ پھینک دیا اور ایک دم دوسرا سلگایا۔

''میرے کمرے کی کھڑکی اس کے مکان کے دروازے کے سامنے کھلتی ہے۔ میں اسے روز ہی کالج جاتے دیکھتا۔ نظریں ملتیں اور جھک جاتیں۔ کچھ دنوں تک تو یہی ہوتا رہا۔ پھر ایک دن ہمت کر کے میں نے اس کے قدموں کے آگے ایک پھول ڈال دیا جسے اس نے اٹھا بھی لیا۔ پھر خطوط کا سلسلہ چلا اور اب ہم چھپ چھپ کے ملتے بھی ہیں۔ ریاض! میں اس کے بغیر واقعی زندہ نہیں رہ سکتا''۔ امتیاز کا لہجہ آخر میں بہت جذباتی ہو گیا۔

ریاض نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

امتیاز کے چہرے پر برہمی کے اثرات پیدا ہوئے۔ اس نے اپنا سگریٹ پھر پھینک دیا۔

ریاض نے منانے کے انداز میں کہا—

''بگڑنے کی بات نہیں ہے میرے دوست! پاگل نہ بنو۔ محبت کرنا آگ سے کھیلنا ہے۔ تمہاری تمنائیں کم سے کم ہوں تا کہ تمہیں ناامیدیوں کے بھیانک گڑھے میں نہ گرنا پڑے۔ کبھی کبھی معصوم دلوں کا یہ سادہ سا کھیل گھر تباہ کر دیتا ہے۔ سنو، تمہیں بھی ہوشیار رہنا ہے''۔

''تمہاری لکچر بازی سے میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ آخر یہ کہاں کی دوستی ہے کہ

ہر وقت ناصح بنے بیٹھے ہیں۔ کبھی تو چارہ ساز بنو، کبھی تو غمگسار بنو۔ امتیاز پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوگئی۔

''میں ہرگز ناصح نہیں، مگر تمہیں خوش ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ آگ سے مت کھیلو۔ اپنی بات منوانا چاہتا تھا''۔

امتیاز پھر رنجیدہ ہوگیا۔

''تم کیا جانو، محبت آگ ہوتی ہے کہ پھول۔ تم تو پتھر ہو پتھر! کبھی پگھلتے ہی نہیں۔ کبھی موم ہو کے دیکھو۔ کبھی دل کی دھڑکن بھی محسوس کرو۔ کبھی کسی کا انتظار کر کے دیکھو۔ کسی کے بارے میں سوچو تو کبھی..... پھر.....''۔

''اب چپ بھی رہو''۔ ریاض بیچ میں بول پڑا، تم یہ کس طرح جانتے ہو کہ میرا دل کبھی نہیں دھڑکا۔ کبھی موم نہیں ہوا۔ میں نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ میں بھی کبھی جذباتی تھا۔ بالکل تمہاری طرح۔ نتیجے میں مجھے کیا ملا؟ کچھ خلش، زندگی کی کچھ تلخ حقیقتیں، میرے دامن کو دیکھو۔ اس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ میرے دل کو دیکھو، یہ خاکستر ہو چکا ہے''۔ ریاض بے حد جذباتی ہوگیا۔ امتیاز تو حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر کچھ خفت، کچھ شکایت کے لہجے میں بولا۔ لیکن تم نے اپنی کہانی اب تک مجھے سنائی نہیں۔ واقعی مجھے تمہارے زخم کا حال معلوم نہیں۔ مجھ سے انجانے میں نمک پاشی ہوگئی۔ مجھے معاف کردو۔ تمہیں کہاں چوٹ لگی۔ کس نے دھوکا دیا آخر؟''

''مجھے دھوکا کسی نے نہیں دیا، میں نے اپنا نشیمن خود ہی پھونکا ہے۔ میری حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت مجھے کھا گئی''۔ اتنا کہہ کے ریاض کچھ سوچنے لگا۔ شاید گزرے ہوئے واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملا رہا تھا۔

لیکن امتیاز سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا۔ اس کا تجسس بڑھ گیا۔

''اب کہو گے بھی یا شاعری کرتے رہو گے؟''

اور ریاض کہنے لگا—

''مس سوزی لوگوں کے لئے بہت حسین نہ تھی۔ لیکن مجھے بہت حسین معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ حسین تھی تو اور بھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رخساروں میں دونوں جانب گڑھے پڑ جاتے تھے۔ اس کا گداز جسم بہت پرکشش اور چال بہت پروقار تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بہت سیاہ تھیں۔ بوٹا سا قد اور تنگ لباس والی یہ سانولی لڑکی مجھے کالج کی لڑکیوں میں سب سے

زیادہ اچھی لگتی تھی"۔

"تو گویا یہ تمہارے کالج کا رومانس تھا؟"

امتیاز نے کہا۔

ریاض نے سنی ان سنی کر دی اور کہانی آگے بڑھائی۔

"پٹنہ یونیورسٹی کا وقت مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ اس دن بی۔اے کے ریزلٹ نکلے تھے۔ میں نے ہسٹری آنرز میں ٹاپ کیا تھا۔ میں اپنے پروفیسروں اور دوستوں سے مبارک باد لینے کے لئے یونیورسٹی گیٹ سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک ترنم ریز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ایکسکیوزمی، آپ مسٹر ریاض ہیں نا؟"

"رائٹ جی، جی ہاں، جی ہاں میں ریاض ہی ہوں"۔ میں گھبرا گیا۔

"میں سوزی ہوں۔ تھرڈ ائیر میں ہسٹری آنرز ہے۔ بٹ فرسٹ ایکسیپٹ مائی کانگریچولیشن"۔

"تھینک یو ویری مچ! بتایئے تو آپ رہتی کہاں ہیں؟ اور مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

"جی میں بھی فریزر روڈ پر رہتی ہوں۔ آپ بھی شاید اسی طرف کہیں رہتے ہیں۔ میں نے فریزر روڈ پر ہی آپ کو اکثر دیکھا ہے۔ میری گرلس فرینڈ نے مجھے آپ کا نام بتایا اور آج ریزلٹ دیکھا تو..."۔ مس سوزی یکا یک رک گئی۔ اس وقت نہ جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اپنے بارے میں اتنی تفصیل جان کے اور وہ بھی ایک لڑکی کی زبان سے، میرا دل جھوم سا اٹھا تھا اور میں نے بہت مشکل سے کہا تھا—

"جی ہاں، میں فریزر روڈ ہی پر رہتا ہوں۔ لیکن آپ اردو بہت اچھی بولتی ہیں"۔ اور مس سوزی نے کہا تھا—

"میرے کمبنیشن میں اردو شروع سے رہی ہے۔ آپ کے پاس ہسٹری کے نوٹس تو ہوں گے، میری مدد کیجئے"۔

"اور وہ یونیورسٹی کی عمارت میں گم ہو گئی"۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" امتیاز کی نظروں کے سامنے مس سوزی کا پورا چہرہ تھرکتا ہوا نظر آیا۔

پھر ہم ملنے لگے۔

تاریخ کے اکثر مسائل پہ ہماری گرما گرم بحثیں رہتیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا

مطالعہ گہرا اور اس کی نظریں وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر مسئلے پر تفصیلی بحث کرتی اور ہر معاملے میں اپنا واضح نقطۂ نگاہ رکھتی۔ میں جوں جوں اس کے قریب آتا گیا اس کے حسن سیرت کا گرویدہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ میری کمزوری بن گئی۔ میری شامیں اداس اور ویران ہو جاتیں جب میں تنہا رہتا''۔

ریاض کا اندازِ گفتگو ایک مقرر کا سا ہو گیا۔

''اس کے بعد؟''

امتیاز نے بس اتنا کہا۔

اور ریاض پھر بولنے لگا—

''میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں بھی اس کی کمزوری ہوں۔ لیکن ہماری محبت کے درمیان ایک اونچی دیوار حائل تھی''۔

ریاض نے ایک لمبی سانس بھری۔

''کون سی دیوار؟'' امتیاز سے چپ نہ رہا گیا۔

''مذہب کی! وہ بہت سخت کرسچن تھی۔ اتوار کو گرجا جانا کبھی نہ بھولتی تھی''۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

امتیاز جلد سے جلد سب کچھ سن لینا چاہتا تھا۔

اس نے کئی بار مذاہب کی عظمت کا احساس میرے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میں بھی پکا مسلمان بنا رہا''۔

ریاض خاموش ہو گیا۔

''اور اسی لئے تم دونوں نہ مل سکے!'' امتیاز نے نتیجہ اخذ کیا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہوئی، مس سوزی نے ہسٹری میں ٹاپ کیا تھا اور اب وہ جلد سے جلد شادی کر لینا چاہتی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں اس نے ایک اہم شرط رکھ دی۔ یہی کہ میں کرسچن بن جاؤں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے''۔

''ڈیم سوزی!'' امتیاز کے مذہبی جذبات کو زبردست چوٹ لگی۔ اچھا ہوا کہ تم نے اسے چھوڑ دیا۔

''تم نے بات سمجھی نہیں۔ میرے ذہن و دماغ میں کئی دن تک زبردست ہلچل رہی۔ مذہب اور محبت میں جنگ، اور تم جانتے ہو کہ فتح محبت کی ہوئی''۔ ریاض نے کہا۔

''توبہ ہے!''

امتیاز کا جی متلا گیا۔

''اور میں نے سوزی سے کہہ دیا کہ میں جلد سے جلد کرسچن ہو جانا چاہتا ہوں''۔ سوزی میرا فیصلہ سنتے ہی پیلی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا—

''مسٹر ریاض! آئی ایم ویری سوری۔ آپ میرے لائق نہیں ہیں۔ آپ اگر اپنے مذہب پر قائم رہتے تو میں آپ کو عظیم انسان سمجھتی اور آپ سے شادی کر لیتی۔ آپ جس آسانی سے آج مذہب بدل لینے کو تیار ہیں، ایک دن بیوی بھی بدل لیں گے''۔

پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور چلی گئی۔ مس سوزی مجھ سے پھر کبھی نہیں ملی۔

پچیسویں قلوپطرہ

قد آدم آئینہ میں انگبیں نے اپنا سراپا دیکھا اور ایک بارگی اس کے رخسار دہک سے گئے۔ آنکھوں میں سرمہ کی ہلکی ہلکی لکیریں کھینچتے ہوئے اس کا بدن کپکپا گیا اور دماغ کے گوشے گوشے میں خیال کی خوشبو سرایت کر گئی۔

''انگبیں! تم سراپا شہد ہو، تم مجسم شراب ہو پیاری!''

''جانِ من! تم چاند سے بھی زیادہ حسین ہو، دیکھنا چاند میں داغ ہے لیکن تم میں کوئی داغ نہیں ہے انگی!''

''سرمایۂ زندگی! تم نہ ملتیں تو میری زندگی دیوانے کا خواب ہو کر رہ جاتی، تمہیں پا کر میں نے سب کچھ پالیا ہے انگبیں!''

''انگی! تم میری کائنات ہو۔ تمہارے بغیر کائنات کی حسین ترین شے بھی میرے لئے بے رنگ و بے کیف تھی!''

''ایمانِ من! حور کا خوب صورت ترین تصور تمہارے پیکر سے زیادہ حسین نہیں ہو سکتا۔ میں مرا تو اللہ سے تمہیں ہی مانگ لوں گا۔ اور بس!''

''چھی!'' انگبیں نے جھٹکے سے اپنے ہی منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بڑے وہ ہیں وہ۔ ایسی باتیں بھی کوئی کرتا ہے۔ مریں ان کے دشمن''۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے سارے وجود میں ایک ارتعاش آ گیا ہے۔ انگبیں زیادہ دیر تک آئینہ کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور ایک ہیجان انگیز تمکنت کے ساتھ بستر پر دراز ہو گئی۔

اس وقت دن کے ساڑھے سات بجے تھے۔

انگبیں کی شادی کو ابھی دس ہی ماہ ہوئے تھے۔ اتنے ہی دنوں میں سہیل اس کے وجود پر اس طرح چھا گیا تھا کہ ایک مترنم سی آواز ہر لمحہ اس کے کانوں میں رس گھولتی رہتی تھی۔ اور یہ رس دراصل سہیل کے جذباتی، حسین اور تراشے ترشائے شہد میں ڈوبے ہوئے جملوں سے رستا۔ ایسی شیریں باتوں سے اس کا انگ انگ مدہوش ہو جاتا اور اس کے شب و روز ایک عالم بے خودی میں

گزر جاتے۔ انگبیں اپنی قسمت پر ناز کرتی اور سہیل کو اپنا مداح پا کر مسرت و کیف کی حسین وادی میں خود کو گم پاتی۔ شادی کے بعد ہی اس کی دنیا میں شادمانی کا ایسا سیلاب آیا تھا جس کی کوئی تھاہ نہ تھی۔ انگبیں کی کائنات اسی سیلاب میں اس طرح بہی جا رہی تھی جیسے اس کا کہیں کنارہ نہیں، کوئی حد نہیں۔

لیکن اچانک ہوا یہ کہ سہیل کو سائیکالوجی میں پی ایچ ڈی کے لئے گورنمنٹ کا اسکالرشپ مل گیا۔ انگبیں کی خوشی کے سمندر میں غم کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ پھر اس لہر کا پھیلاؤ بڑھتا گیا۔ بڑھتے بڑھتے خود ایک سمندر بن گیا اور وہ تاریخ آ ہی گئی جب سہیل آکسفورڈ کو پرواز کرنے کے لئے پر تولنے لگا۔

''تم اپنے آنسوؤں کے موتیوں کو سنبھالو، دامن پر نہ بکھر جائیں''۔

''تم اس طرح روتی رہیں تو میں تمہارے آنسوؤں میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاؤں گا''۔

''میرا راستہ جل تھل نہ کرو انگبیں!''

''تمہاری یاد میرے ساتھ ہے، پردیس میں یہ مجھے سہارا دیتی رہے گی''۔

''تمہاری آنکھوں کی شراب کا خیال مجھے مدہوش کرے گا تو تمہارے حسن کا تقدس مجھے سنبھالا دے گا!''

''تمہاری زلف گرہ گیر کا خیال مجھے میرے مسائل کی طرف توجہ دلائے گا تو تمہارے چہرے کا پرکاش ان پر روشنی ڈالے گا''۔

لیکن ایسی میٹھی باتوں سے انگبیں کے دکھ کا مداوا نہ ہو سکا اور پلک جھپکتے اس کی زندگی کی روح اس سے الگ ہو گئی۔

سہیل آکسفورڈ آ گیا۔

لیکن پندرہ دنوں کے اندر ہی انگبیں کی خزاں میں ایک پھول کھلا۔ سہیل کا خط ملا۔

''انگی!

وہ جو تم نے سنا ہے جب ذرا گردن اٹھائی دیکھ لی! تو سنو! تم ہر وقت ہر لمحہ میرے ساتھ ہو۔ افسوس ناک دوری اور بعد حیرت ناک قربت میں بدل گیا ہے۔ تمہاری مخمور آنکھوں کی یاد اپنے ساتھ ایک پورا میخانہ لاتی ہے اور جام پر جام لنڈھاتی ہے.....''۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد انگبیں کے دل کے زخم کو ایک اور پھاہا ملا۔ سہیل نے لکھا تھا—

''ہوا جو اچانک پردے کو ہلاتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم آ گئیں۔ کتابوں کے اوراق پر تمہاری شبیہ کھنچ سی جاتی ہے، موسیقی کی نغمگی پر تمہاری آواز کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہاں کی سبھا کی

پریوں میں تمہارے رنگ روپ کی تلاش دیوانگی ہے۔ مغرب کی حوریں تمہیں دیکھ لیں تو بس تمہارے آگے پانی بھریں۔ جی چاہتا ہے وقت کو پرلگ جاتے یا مجھ میں اڑنے کی طاقت آجاتی۔ واقعی تم سے دور رہنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ ابھی تو پورے دوسوا دوسال باقی ہیں۔ یہ وقت کس طرح کٹے گا۔ یہ پہاڑ کیسے ڈھے سکیں گے؟'' اور واقعی وقت کو پرلگ گئے اور پہاڑ روئی کے گالے بن گئے، انگبیں کی روح اس کے جسم کی طرف لوٹنے لگی۔ سہیل کا آخری خط تھا۔

''میری پیاری انگی!

مٹھائیاں تقسیم کرو کہ میں پی ایچ ڈی ہوگیا۔ ہائے کتنی دشواریوں سے یہ وقت گذرا۔ میں تو کئی بار باؤلا بن گیا۔ تمہاری گونگی تصویر سے گھنٹوں باتیں کرتا رہا۔ سینے سے لگایا تو کبھی آنکھوں سے چوما۔ کسے معلوم کہ یہ سراب کتنا تسکین دے گیا۔ دیکھو یہ خبر دیتے ہوئے میرے قلم میں کتنی لرزش ہے کہ میں ۸ دسمبر کو ۸ بجے دن میں پٹنہ ہوائی مستقر پر لینڈ کر جاؤں گا۔

اور آج دسمبر کی ۸ تاریخ تھی۔ دن کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ گذشتہ شب انگبیں رات بھر نہ سو سکی تھی۔ خوشی کی روشنی سے اس کی آنکھیں چکا چوند ہوگئی تھیں جن میں نیند کی سمائی ممکن نہ تھی۔ پھر رات کے ایک بڑے حصے میں وہ سہیل کے تصور میں کھوئی بیٹھی رہی تھی۔ اپنے آپ میں واپس آئی تو کپڑوں کے انتخاب میں الجھ گئی۔ اس الجھن سے فرصت ملی تو صبح ہو چکی تھی۔ جملہ ساز و سامان سے لیس ہو چکی تو آئینہ کے سامنے سرمہ کی سلائی آنکھوں میں پھیرنے لگی۔ اور تب اس نے محسوس کیا کہ اس کے سارے وجود میں ایک ارتعاش آگیا ہے۔ وہ زیادہ دیر تک آئینہ کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور ایک ہیجان انگیز تمکنت کے ساتھ بستر پر دراز ہوگئی۔ اب ساڑھے سات بج چکے تھے اور سہیل آگیا۔ انگبیں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ جب تخلیہ ہوا تو اس کے کانوں میں رس گھل گئے۔

''انگی! میں آکسفورڈ میں ایک مرصع نیام کی طرح رہا جس کی تلوار ہندوستان ہی میں رہ گئی تھی''۔

دوسرے دن ایک ضرورت سے انگبیں نے سہیل کی اٹیچی کھولی۔ اسے ایک ڈائری ملی۔ ایک تاریخ میں سہیل نے لکھا تھا ''انگبیں سے پہلے صرف چار ہندوستانی لیلاؤں سے واسطہ رہا تھا۔ آکسفورڈ میں ۲۰ قلوپطرائیں ملیں۔ معیار حسن اور سپردگی کے اعتبار سے انگی کا پچیسواں نمبر ہے!''

انگبیں کے ہاتھ سے ڈائری چھوٹ گئی۔ (مطبوعہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، ۱۹۶۲ء)

علاجِ غمِ دل

شیتل سے میری ملاقات بالکل اتفاقیہ ہوئی تھی۔ بڑے ڈرامائی انداز میں۔ اس شام ہوا میں خنکی تھی۔ بارش رک رک کر ہو رہی تھی۔ ایسے میں فضا کچھ کیف آگیں ہو ہی جاتی ہے۔ میں کافی پینے کے لئے کیفے ویز چلا آیا۔ ویز متوقع طور پر بھر چکا تھا۔ کوئی میز خالی نہ تھی اور میں واپس ہونے ہی والا تھا کہ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''تکلیف نہ ہو تو میرے سامنے کی کرسی پر تشریف رکھئے''۔

میں نے دیکھا کہ مجھ سے ہم کلام ایک خوبرو نوجوان ہے۔ اس کے بال گردن کی طرف بڑھے ہوئے ہیں۔ پیشانی اونچی اور ذہانت کی عکاس ہے، آنکھیں موٹی ہیں جن میں حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ پیشانی اونچی اور ذہانت کی عکاس۔ یہ وجیہہ شخص ایک سانولی متناسب جسم، کھلے ہوئے بالوں اور نیم خوابیدہ کالی آنکھوں والی لڑکی کے سامنے بیٹھا ہے۔

''شکریہ.....نوازش آپ کی!''

میں کرسی پر قدرے تکلف کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''میرا نام شیتل ہے۔ آپ ہی کے شہر میں رہتا ہوں۔ لیکن آپ کا تعارف؟'' میں نے دیکھا کہ اس کے لہجہ میں کوئی ہچکچاہٹ، کوئی بناوٹ نہ تھی۔

''میرا مختصر سا نام راہی ہے۔ گیا کالج میں نفسیات پڑھاتا ہوں۔ کلب روڈ پر رہتا ہوں۔ دروازے پر نام کی ایک تختی لٹکتی ہے''۔

میں نے اپنی تفصیل بتادی۔

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔ ہاں مسرت میں اضافہ ضرور ہو، اگر آپ اس میز پر میرے مہمان رہیں''۔

میں ایک اجنبی سے ایسے خلوص کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ لیکن شیتل نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا۔ بیرے کو آواز دی اور متعدد چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ جب ہم کئی

پلیٹیں خالی کر چکے اور کافی کا دور بھی ختم ہو گیا تو بل آ گیا۔ شیتل نے فوراً پانچ پانچ کے دو نوٹ طشتری میں رکھ دیئے اور سونف چبانے لگا۔ پھر یکا یک کھڑا ہو گیا۔ لڑکی بھی اٹھ گئی۔

''معاف کرنا پروفیسر! جلدی ہے ورنہ اور بیٹھتا۔ پھر ملاقات ہوگی''۔ دونوں ہی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ میں حیرت زدہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ دروازے پر پہنچ کر دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ میں تنہا بیٹھا شیتل کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا کردار میرے لئے بہت تعجب خیز تھا۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھرے۔

''شیتل فراڈ ہے۔ آج کا خلوص آئندہ کی کسی بڑی سازش کا پیش خیمہ ہے''۔

''شیتل آج کا آدمی نہیں۔ مہمان نوازی کے معاملے میں وہ پرانی تہذیب کا پابند ہے''۔

''شیتل پاگل ہے۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ غیر معمولی خلوص اس کے پاگل پن کی علامت ہے''۔

اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

یکا یک وہ پراسرار لڑکی میرے ذہن کے ایک گوشے میں ابھری۔

''وہ خاموش سانولی سی لڑکی کون تھی؟''

''شیتل نے میرا اس سے تعارف کیوں نہ کرایا؟''

میں نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔ اس طرح کسی کے بارے میں سوچتے رہنے سے فائدہ؟ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا میں ویز سے باہر آ گیا۔

دو ماہ گزر گئے۔

میں شیتل کو بھول چکا تھا کہ ایک دن یکا یک بھارت ٹاکیز کے کاؤنٹر پر اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم نے مجھے پہچانا پروفیسر؟''

میں نے دیکھا شیتل ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس ہے۔ کلائی پر ایک خوبصورت گھڑی بندھی ہے۔ داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں ہیں۔ اور.....اس کے ساتھ تین لڑکیاں بھی ہیں۔ مجھے یکا یک وہ سانولی لڑکی یاد آئی جو اب اس کے ساتھ نہ تھی۔ اور میں شیتل سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔

''خوب ملے! معلِ اعظم دیکھنے آ گیا ہوں''۔

شیتل نے اس بار کچھ زیادہ گفتگو نہ کی۔ بالکونی کے پانچ ٹکٹ خریدے اور مجھے کھینچتے ہوئے ہال کے اندر لے آیا۔ پکچر ختم ہوئی تو ہم ویز چلے آئے۔ اس بار پھر شیتل ہی نے بل کے پیسے ادا کئے۔ کھانے پینے کے دوران میں کوئی خاص گفتگو نہ ہوئی۔ میں اجنبی لڑکیوں کے ساتھ اس طرح بیٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ اور مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ میرے اسٹوڈنٹس مجھے اس عالم میں دیکھ رہے ہوں گے۔

پھر ہم ہوٹل سے باہر چلے آئے۔

ہاتھ ملانے کے بعد شیتل ایک طرف چلا گیا، لڑکیاں دوسری طرف۔ میں نے کلب روڈ کی راہ لی۔

اس بار میں پھر شیتل کے کردار سے متاثر ہوا۔ وہ میرے لئے بھی پراسرار بنتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس کے کیریکٹر کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ میں صرف دو نتیجے اخذ کر سکا۔

''شیتل امیر زادہ ہے، اسے روپے خرچ کرنے کی لت ہے''۔

''شیتل بدچلن ہے، نئی نئی لڑکیوں سے دوستی کرنا اس کی ہابی ہے''۔

شیتل جیسے مخلص آدمی کے بارے میں یہ دو فیصلے مجھے خود بھی اچھے نہ لگے۔ اور ایک بار پھر میں نے اپنے ذہن کو کھرچ دیا۔

ایک ماہ اور گزر گیا۔

اور وہ جاڑے کی شام تھی۔ میں کپڑے بدل رہا تھا کہ شیتل اپنے نوکر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس کی طرف لپکا اور کرسی بڑھائی کہ وہ بول پڑا—

''پروفیسر تم یہ انگوٹھی رکھو اور مجھے بیس روپے دے دو''۔

میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔

میں نے خاموشی سے بیس روپے شیتل کو دے دیئے۔

''اور یہ انگوٹھی؟'' شیتل نے انگوٹھی بڑھائی۔

''مجھے شرمندہ نہ کرو دوست! مجھے اپنا ہمدرد سمجھو''۔ میں نے بمشکل اتنا کہا اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

دو ہفتے بعد میں نے پھر شیتل کو پنجاب ہوٹل میں دیکھا۔ لیکن جان بوجھ کر میں چپ ہو گیا کہ کہیں وہ دیکھ نہ لے۔ ورنہ آج پھر کچھ نہ کچھ مجھ پر خرچ کرے گا۔ میں نے دیکھا اس بار اس

کے ساتھ چار لڑکیاں ہیں۔ بدصورت، بدہیئت میز پر کئی پلیٹیں پڑی تھیں۔ میں نے اندازہ کیا کہ یہ کھانا پینا دیر سے ہو رہا ہے۔ پھر میری نظر شیتل کے لباس پر گئی۔ اس کا قیمتی سوٹ کہیں نظر نہ آیا۔ کلائی کی گھڑی غائب تھی۔ دو انگوٹھیوں کی جگہ انگلی میں صرف ایک انگوٹھی تھی۔ مجھے شیتل کی بدلی ہوئی حالت پر افسوس ہوا۔ ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔ آخر یہ شخص کس دنیا کا باشندہ ہے۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اس میں شیتل کے لئے تلخی ہی تلخی تھی۔ میں گھبرا کر ہوٹل سے نکل گیا۔

اور ایک دن وہ مجھے کرن سنیما کے پاس دو لڑکیوں کے ساتھ ملا۔ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تو تھی ہی، ان لڑکیوں کو دیکھ کر میرا دل اور بھی مکدر ہو گیا۔ میں نے شیتل سے بات کرنی مناسب نہ سمجھی اور نکل بھاگنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔ یکا یک اس نے دست سوال دراز کر دیا۔

''مجھے ان لڑکیوں کو ''سرال'' دکھانی ہے۔ مجھے دس روپے دے دو''۔

میں نے بڑی حقارت سے دس کا ایک نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ ایسے شخص سے دوستی کیوں کی۔ یہ تو بالکل آوارہ ہے، اوباش ہے، غنڈہ ہے۔

میری طبیعت اس قدر مکدر ہو چکی تھی کہ میں نے پکچر دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور گھر واپس آ گیا۔

دو ماہ تک شیتل سے میری ملاقات نہ ہوئی اور نہ وہ میرے یہاں آیا، نہ میں نے اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی ضرورت سمجھی۔

اور اس شام میرا موڈ دن ہی سے خراب تھا۔ کالج کے پرنسپل سے ایک سلسلہ میں زبردست اختلاف ہو گیا تھا۔ میں چلا آیا۔ میں نے دیکھا شیتل کیفے کے دروازے پر کھڑا ہے۔ وہ ایک دم معمولی اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے پاجامے قمیض میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھ وہی سانولی سی لڑکی ہے جسے پہلی بار میں نے شیتل کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں نے دور سے دیکھا کہ لڑکی زار زار رو رہی ہے۔ پھر یکا یک شیتل نے اس لڑکی کو دھکا دیا اور تیزی سے ایک طرف نکل گیا۔

میرے دل میں شیتل کے لئے نفرت اور حقارت پہلے ہی کیا کم تھی، میں دبے پاؤں ویز آیا اور کاؤنٹر کے قریب منیجر کو مخاطب کر کے اپنے دل کا بخار نکالنے لگا۔

''آپ شیتل جیسے آدمی کو ہوٹل میں آنے ہی کیوں دیتے ہیں۔ آپ کے اچھے کسٹمروں پر

اس کا برا اثر پڑے گا۔ دیکھئے ابھی وہ ایک آوارہ لڑکی کے ساتھ تھا''۔

''ایسی باتیں آپ نہ کریں۔ شیتل بابو بد چلن نہیں ہیں۔ بے چارے انکم ٹیکس آفیسر تھے۔ بیوی کے انتقال کے چھ ماہ بعد ملازمت ترک کر دی۔ اب بے چارے کی یہ درگت ہے۔ آپ جانتے نہیں وہ طرح طرح کی لڑکیوں کو کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ وہ ان میں اپنی بیوی کا رنگ روپ تلاش کرتے ہیں۔ بھلا بتایئے تو، یہ پاگل پن نہیں تو کیا ہے۔ کہیں مرنے والی بھی زندہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ سانولی لڑکی تو ایک بڑے افسر کی بیٹی ہے۔ چاہتی ہے کہ شیتل بابو اس سے بیاہ کر لیں لیکن یہ مانتے ہی نہیں ہیں!''

میں حیرت زدہ رہ گیا۔

یہ انکشاف میرے ذہن پر ایک طمانچے کی طرح ؔ ۔ میری آنکھوں میں شیتل کا معصوم سا چہرہ ابھر آیا۔

اور پھر نہ جانے کیوں آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، اپریل ۱۹۶۲ء)

تبسم کی لکیر

مسٹر ایم. وسیم تقریباً پندرہ سال بعد مجھے آج پھر گاندھی میدان میں مل گئے۔

مسٹر ایم. وسیم ہم سب پر حاوی تھے، عجب ذہن پایا تھا انہوں نے۔ جیسے چوبیس پچیس کی ادھ کچی عمر میں مغرب کے تمام علوم وفنون پر قادر ہو گئے ہوں۔ ڈیلی شیو بناتے، مناسب لباس زیب تن کرنے کے بعد ٹھیک وقت پر کالج پہنچ جاتے۔ نصاب کی کتابوں کے علاوہ ان کے پاس ہر وقت مغربی زبان وادب کی موٹی موٹی کتابیں ہوتیں۔ جب وہ ہم سے بحث کرتے تو بڑے عالم فاضل نظر آتے۔ انگریزی لب ولہجہ پر پوری طرح قادر تھے۔ تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کے ہم لوگوں کا ناطقہ بند کیے رہتے۔ ہم جب کبھی اپنی زبان کی بات کرتے تو وہ برس پڑتے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو میں شاعری ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔ ڈرامے تو عنقا ہیں۔ اچھے افسانوں اور ناولوں کا بھی کال ہے۔ فلسفہ عمرانیات اور معاشیات کے علوم ہمارے ملک کے دائرہ عمل سے باہر ہیں۔ ہمارا کلچرل سرمایہ برائے نام ہے۔ تہذیب وتمدن کے الفاظ مبہم ہیں۔ ہمارے ہاں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ عام طور سے ہمارے ملک کی عورتیں جاہل ہیں۔ انہیں نہ اپنا مقام ہے نہ اپنے شوہروں کا۔ وہ مردوں کے کاندھوں پر بوجھ ہیں، اور یہ بوجھ احمق شوہر خواہ مخواہ ڈھونے پر مجبور ہیں۔ ہمارے ہاں نفاست نام کی کوئی چیز نہیں، ہم اپنے ساتھ میلے کچیلے بچوں کی ایک بٹالین لئے پھرتے ہیں جنہیں کھلانے کے لئے نہ ہمارے پاس پیسے ہوتے ہیں نہ ان کی تربیت وتعلیم کے لئے مناسب ذرائع۔ ہماری تہذیب ایک سڑی ہوئی لاش ہے جس سے ہم کیڑوں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔

غرض مسٹر ایم. وسیم ہم سب پر حاوی تھے۔ انہوں نے عجیب سرکش اور انقلابی ذہن پایا تھا۔ ان کے سامنے ان کے بہت سے ساتھیوں کی کور دبتی تھی۔ ان سے ڈرنے والوں میں میرا نام سرفہرست تھا۔ وہ مجھے احمق سمجھتے تھے اور ان کا یہ خیال بے بنیاد نہیں تھا۔ میری تعمیر میں واقعی ایک صورت خرابی کی مضمر تھی کہ میں اپنے قومی وتہذیبی سرمایہ کو ایک قدامت پسند کی طرح عزیز رکھتا

تھا۔ مجھ میں کسی لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرأت نہ تھی۔ ہم دونوں انگریزی ادب میں ایم.اے کر رہے تھے۔ لیکن ٹی ایس ایلیٹ کی شہرۂ آفاق نظم مجھے آج تک پوری یاد نہ ہو سکی، جب کہ غالب تو غالب، مجھے کئی مقامی شاعروں کی غزلیں اور نظمیں ازبر تھیں جنہیں میں کبھی تحت اللفظ اور کبھی ترنم سے غسل خانے کی تنہائی میں یا دوستوں کی محفل میں، جہاں مسٹر ایم. وسیم نہ ہوتے، بے تکلفی سے پڑھتا۔ مسٹر ایم. وسیم آفت ناگہانی کی طرح مجھ پر مسلط تھے۔ بی.اے اور ایم.اے میں ان کے اور میرے مضامین ایک تھے۔ انگریزی آنرز کے علاوہ فلسفہ اور تاریخ کی کلاسیں بھی ہم ساتھ ہی لیتے۔ وہ انگریزوں کی طرح چست اور موزوں لباس پہنے ہوئے جب مجھ پر گہری تنقیدی نظر ڈالتے تو میری جان نکل جاتی۔ احساسِ کمتری مجھ پر یلغار کرتا اور میں بے بس ہو کر اپنے بوٹ کے فیتے کسنے لگتا جو نہ معلوم کیوں ایسے مواقع پر ڈھیلے ہو جاتے۔ میں سوچتا مسٹر ایم. وسیم آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہیں ''تم کب تک جاہل رہو گے؟ اعلیٰ تعلیم کا تم پر کب اثر ہوگا؟ اور..... تمہیں یہ انگریزی پڑھنے کی کیا سوجھی؟''

ایک ایسے ہی کمزور لمحے میں ڈاکیہ نے مجھے ایک پوسٹ کارڈ دیا تھا۔ اس وقت مسٹر ایم. وسیم میرے ساتھ تھے۔ اسے اتفاق کہئے کہ اسے پڑھتے ہی میرے لبوں پر تبسم کی ایک لکیر کھنچ گئی، یہ ہنسی میرے لئے قیامت خیز ثابت ہوئی کیونکہ مسٹر ایم. وسیم نے فوراً سوال کیا ''کیا ہے اس خط میں؟'' ہم ہندوستانی بہت جذباتی ہوتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو جی بھر کے، اور غم مناتے ہیں تو سینہ کوٹ کوٹ کر۔ اس وقت جو خوشی مجھے حاصل ہوئی تھی میں اسے چھپا نہ سکا۔ میں نے مسکرا کر کہا ''گرمیوں کی تعطیل میں میرا عقد ہو رہا ہے''۔

''لیکن کس سے؟''

''اماں نے رشتہ طے کیا ہے، مجھے تفصیل معلوم نہیں''۔

مسٹر ایم. وسیم کے جدید ذہن کو جیسے ایک تازیانہ لگا۔ وہ مجھ پر انگریزی میں اور انگریزوں کے سے انداز میں برس پڑے۔ جو کچھ انہوں نے کہا اس کا اردو ترجمہ یہ ہے — ''شرم، شرم۔ تم اتنے گنوار، دہقانی اور بوڑھے ہو کہ اپنی بیوی تک خود نہیں چن سکتے۔ ارے احمق! اپنی زندگی کو کیوں جہنم بناتے ہو اور گھسی پٹی بوسیدہ روایتوں کا ساتھ دے کر کیوں ملک کی ترقی کی راہ میں روڑا بنتے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ تمہاری شریک حیات کتنی پڑھی لکھی ہے؟ سوشل ہے یا نہیں، خوبصورت ہے یا نہیں۔ اور تم پھر بھی خوش ہو، لعنت ہے تم پر۔ شرم شرم''۔

اور واقعی شرم سے میری گردن جھک گئی۔ گردن جھکائے ہوئے میں نے پھر اماں کے خط پر غور کیا اور تبسم کی ایک لکیر پھر لبوں پر پھیل گئی جسے مسٹر ایم. وسیم کی نظروں سے بچانے کے لئے میں اپنے بوٹ کے فیتے باندھنے لگا جو پتہ نہیں کیسے کھل گئے تھے؟

اور اس دن گاندھی میدان میں ''رام لیلا'' کے باعث بہت بھیڑ تھی۔ میری شامت اعمال کہئے کہ میں نے اس کا تذکرہ مسٹر ایم. وسیم سے کر دیا۔ اب کیا تھا، ان کے مغربی انداز کے جدید ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ تلملا گئے اہ. تلملا کر اپنے خاص انداز میں کہنے لگے — ''پٹنہ میں کب سے انٹونی اینڈ کلوپٹرا ہے، کچھ سیکھنا چاہو، کچھ جاننا چاہو، محبت کے فلسفہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہو تو اسے دیکھو، کیوں اول فول چیزوں میں اپنا وقت برباد کرتے ہو۔ آخر کیوں؟'' اور میں ایک بار پھر شرمسار ہوا اور شرمسار ہو کر اور ایک طرف منہ اٹھا کر غور کرنے لگا کہ ''رام لیلا'' اور ''انٹونی اینڈ کلوپٹرا'' یعنی، یعنی..... میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، کچھ بھی نہ آیا۔

ہم دونوں نے ایم. اے کر لیا تھا۔ مسٹر ایم. وسیم کا نتیجہ شاندار تھا، بہت ہی شاندار۔ انہوں نے ٹاپ کیا تھا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ آئے تھے۔

پھر ہم ایک مدت کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میں ان دنوں مالی دشواریوں میں مبتلا تھا۔ میری شادی ہو چکی تھی اور ہم دونوں میں ایک کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ میری نگار اپنی ماں پر گئی تھی۔ اس کی انگلیاں لمبی لمبی تھیں، صاف و شفاف اور نوکیلی۔ آنکھیں بڑی بڑی، روشن اور ذہین۔ کبھی کبھی جب میں اپنی اس زندگی پر غور کرتا، شبینہ کو دیکھتا، نگار کی ناک صاف کرتا تو مسٹر ایم. وسیم میرے ذہن کے نہاں خانے سے ابھر آتے۔

''شرم، شرم، تم اتنے گنوار، دہقانی اور بوڑھے ہو کہ اپنی بیوی تک نہیں چن سکتے''۔ اور مجھے اپنی ماں کا وہ خط یاد آ جاتا..... اور میں سوچتا کیا میں شبینہ سے بہت اچھی لڑکی ڈھونڈ سکتا تھا، جس کی غلافی آنکھیں مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگتیں، قربانی اور ایثار کا ایسا مجسمہ میں کہاں تلاش کرتا، یہ ہنستا ہوا چہرہ اور میری قلیل آمدنی اور میرے بڑھتے ہوئے اخراجات! مانا کہ شبینہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، لیکن زیادہ پڑھی لکھی لڑکیاں زیادہ کر بھی کیا سکتی ہوں گی؟ یہ دہقانی عورت جو ہر دکھ ہنس کر جھیل لیتی ہے، مسائل کو اپنے دلکش تبسم میں گھول کر پی جاتی ہے، میری بوڑھی اور بیمار ماں کی خدمت کرتی ہے۔ اس سے زیادہ کیا چاہئے، کیا چاہئے اس سے زیادہ مجھے؟

پھر مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر ایم. وسیم لندن جا کر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور وہیں انہوں نے

اپنی پسند کی ایک شادی بھی کر لی ہے۔ شاباش! میری زبان سے یکا یک نکل گیا۔ اس لئے کہ مسٹر ایم. وسیم سے مجھے یہی توقع تھی۔ ان کا ذہن مغربی تھا اور جدت پسند بھی۔ وہ بہت پڑھے لکھے تھے۔ مغربی ادب کو تو وہ گھول کر پی گئے تھے۔

اِدھر میری حالت بھی قدرے سدھر گئی تھی۔ مقامی کالج میں لکچرر شپ کے علاوہ کہانیوں سے بھی آمدنی ہو جاتی تھی، لیکن ساتھ ساتھ خاندانی ترقی بھی ہو رہی تھی۔ میری بٹالین دو لڑکیوں اور دو لڑکوں پر مشتمل ہر وقت میرے گھر میں پریڈ کرتی رہتی۔ اماں سے نبٹنے کے بعد شبینہ ان کے لفٹ رائٹ میں لگی رہتی۔ ان کے کپڑے دھوتی، انہیں وقت پر کھلاتی پہناتی، اسکول بھیجتی اور جو وقت بچتا، مجھے بہلانے میں گزارتی۔ اپنی محبتوں سے میرے دکھ درد کا علاج کرتی۔ ایسے میں کبھی کبھی مجھے مسٹر ایم. وسیم یاد آ جاتے اور ان کے جملے بھی — ''ہمارے ہاں نفاست نام کی کوئی چیز نہیں ہے، ہم اپنے ساتھ اپنے میلے کچیلے بچوں کی ایک بٹالین لئے پھرتے ہیں''۔ ایسے میں میرا دل مجھ سے سوال کرتا — ''ان میلے کچیلے بچوں کے بغیر تیری زندگی کا کیا تصور ہوگا؟'' اور میں جلدی سے اپنی فوج میں سے کسی ایک کو پکڑ کر بے تحاشہ چومنے لگتا اور مجھے احساس تک نہ ہوتا کہ اس کی ناک کی ریزش میرے منہ میں چلی آئی ہے۔ میں بھی عجب گنوار تھا کہ مسٹر ایم. وسیم کی صحبت کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔

''توبہ توبہ آپ مجھے کیا بنانا چاہتے ہیں''۔ یہ تھا میری بیوی کا جواب جب میں نے کہا تھا کہ ایک امریکی رقاصہ بانکی پور کلب میں اپنا خاص رقص پیش کرے گی۔

اس دن میں تنہا کلب چلا گیا تھا۔ اداسی کے احساس کے ساتھ۔ اس وقت مجھے مسٹر ایم. وسیم یاد آئے تھے جنہوں نے کہا تھا — ''تمہاری بیوی سوشل ہے یا نہیں!'' آج کی بات نے مجھے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ شبینہ کلب نہیں جا سکتی، وہ سوشل نہیں ہے! میں ایک ذہنی الجھن لئے کلب آ گیا تھا..... امریکی رقاصہ نے واقعی اپنا کمال دکھایا تھا، میری گردن کئی بار جھکی اور کئی بار میں نے اپنے جوتے کے فیتے درست کئے اور کئی بار رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ مجھے شبینہ یکا یک یاد آ گئی تھی..... ''توبہ توبہ آپ بھی مجھے کیا بنانا چاہتے ہیں؟'' ہاں میں اسے کیا بنانا چاہتا ہوں! میرے دماغ نے مجھ سے پوچھا۔ میرا ذہن میرا ساتھ دیتا تو شاید کوئی جواب دے پاتا۔ اس وقت مسٹر ایم. وسیم ہوتے تو ضرور میری مدد کرتے کیونکہ ان کا ذہن انقلابی تھا اور ہم سب پر بھاری تھا۔

اور آج تقریباً پندرہ سال بعد مجھے مسٹر ایم. وسیم گاندھی میدان میں مل گئے ہیں، جہاں پھر ''رام لیلا'' ہے۔ ان کے پیچھے سات بچوں کی ایک بٹالین ہے، ایک سکڑی سمٹی سی خاتون ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا ہے۔ لیکن مسٹر ایم. وسیم ذہین ہیں اور ہم سب پر بھاری ہیں، اس لئے میری حیرت کو سمجھ رہے ہیں۔ ''میں نے لندن میں تین شادیاں کیں، تینوں ناکام رہیں، اور یہ تمہاری بھابھی کلثوم ہیں، یہ میری تمام تر بدعنوانیوں کے باوجود میرا انتظار کرتی رہیں۔ ان کی بچپن میں مجھ سے منگنی ہو چکی تھی۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں، لیکن ان کی بدولت میری زندگی سنبھل گئی ہے، سنور گئی ہے؟'' اتنا کہہ کے وہ اپنے ایک بچے کی ناک صاف کرنے لگے۔ میں نے جھٹ ان کے ایک بچہ کو اٹھا لیا اور اسے چومنے لگا۔ اسی اثناء میں، میں نے محسوس کیا کہ مسٹر ایم. وسیم کے لبوں پر تبسم کی ایک لکیر کھنچ گئی ہے، جسے شاید وہ مجھ سے چھپانے کے لئے جھک گئے اور جھک کر اپنے جوتے کے فیتے باندھنے لگے جو نہ جانے کیسے کھلے رہ گئے تھے۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، ستمبر ۱۹۶۴ء)

اہرمن اور یزداں

وہ رات مجھ پر بھاری تھی۔ طبیعت مکدر تھی اور دل ڈوبا ڈوبا سا تھا۔ باتیں تو یونہی شروع ہوئی تھیں، جن کا نہ کچھ سر تھا نہ پیر۔ لیکن موضوعات بدلتے گئے تھے، مسلسل اور متواتر فلمی اداکاروں کے چوچلوں کے بعد ہی مس رتنا کا حسن زیر بحث آ گیا تھا۔ کالج کی حسینائیں گن لی گئی تھیں، زلف و رخسار اور دار و رسن پر تبصرے ہونے لگے تھے۔ موجودہ حکومت کے موقف اور سائنس کے کارناموں کی باتیں آ گئی تھیں۔ پھر مسٹر بھونسلے کو مس رتنا کی ناک کا خیال آیا تھا، جو اس کے تراشیدہ، ڈھلے ڈھلائے مثالی پیکر کے لئے مور کا پاؤں تھی۔ پلاسٹک سرجری کے خیال نے مسٹر بھونسلے کو خوش کر دیا تھا۔ ان کے نتھنے پھولنے لگے تھے، آبنوسی چہرے پر تمازت کی لکیریں دوڑ گئی تھیں، منہ میں رال بھر گئی تھی، نچلے ہونٹ کی خارش کو دانت سے کھجاتے ہوئے تھوک کی پھوار کے ساتھ انہوں نے کہہ دیا تھا— ''مسٹر اوجھا! آپ سائنس کے اس پریکٹیکل دور میں شادی وادی کی باتیں کرتے ہیں، مجھے آپ کو میوزیم میں رکھ دینے کا خیال آتا ہے۔ آج آدمی چاند پر بسنے کی سوچتا ہے اور آپ قبر کے موہوم عذاب کا فسانہ لئے بیٹھے ہیں''۔

مجھ میں تنقید برداشت کر لینے کی سکت ہے۔ کم از کم میرے دوستوں کا میرے متعلق یہی خیال ہے لیکن میں نے مسٹر بھونسلے کے ریمارک کا برا مان لیا تھا۔ ''آپ مادّی آدمی ہیں، مسٹر بھونسلے روحانی حقائق سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ سائنس کی ترقی اور زندگی کی سچی اور حقیقی قدروں میں کوئی بیر نہیں۔ سائنس کی ترقیاں مذاہب کی رو نہیں ہیں مسٹر بھونسلے''۔ اور میں چپ ہو گیا تھا۔ تب مسٹر بھونسلے نے بڑی حقارت سے میری طرف دیکھا تھا جیسے میں نرا جاہل اور بے وقوف ہوں۔ پھر انہوں نے جیسے ساری رال شراب کی طرح پی لی تھی۔ عجیب سرمستی کے عالم میں بولے تھے: ''میں نے آپ کا صحیح مقام بتا دیا ہے۔ مسٹر اوجھا، آپ کو شیشے میں بند کر کے واقعی میوزیم کے کسی گوشے میں رکھ دینا چاہئے۔ اے مسٹر اگر میں مس رتنا سے باضابطہ بیاہ رچاؤں تو پھر ان گنت حسیناؤں کو کیوں بیوی بننے سے محروم رکھوں، جن کے دہکتے ہوئے جسم نے میری

راتیں روشن کی ہیں۔ میں تو زلفوں کا شکاری ہوں، بھونرا ہوں، پھولوں کا رس چوستا ہوں اور اڑ جاتا ہوں''۔ مجھے مسٹر بھونسلے میں کوئی شیطان چھپا نظر آیا تھا اور میرا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا تھا: ''تو پھر مسٹر بھونسلے آدمی اور حیوان میں کیا فرق باقی رہ گیا''۔

''فرق ہے مسٹر اوجھا اور بڑا نمایاں فرق ہے، حیوان وہ ہے جو فٹ پاتھ پر سوتا ہے، جس کے پاس رہنے کے لئے کچھ نہیں ہے اور نہ کھانے کے لئے، جس کی بیوی اکثر اوقات ٹی بی کا شکار ہو کر مر جاتی ہے اور جس کے بچے میلے میں پلتے ہیں۔ مگر جوان خوبصورت بیٹیاں مجھ جیسے لوگوں کو خوش کرنے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہیں''۔

''اور مسٹر بھونسلے انسان کی کیا تعریف ہے آپ کے آگے''؟ میں نے طنزاً پوچھا تھا۔

''انسان میں ہوں جس کی رگوں میں گرم خون اور تجوری میں بڑی رقم ہے اور بستر پر نسین جوان عورتیں ہیں جس کی عمارتوں کی گنتی نہیں ہے اور جو ہر شب عورت اور ہر سال اپنی کار کا ماڈل بدل دیتا ہے''۔

میرا موڈ بے حد پراگندہ ہو گیا تھا، ڈرتے ڈرتے میں نے ایک اور بات پوچھی تھی ''تو مس رتنا کے ساتھ آپ کا یہی کچھ رویہ رہے گا کیا؟'' اور مسٹر بھونسلے کا آبنوسی چہرہ ایک بار پھر تنور بن گیا تھا، منہ میں رال بھر گئی تھی اور وہ تھوک کی پھوار پھینکتے ہوئے چہکے تھے۔ ''بالکل مسٹر اوجھا، بالکل، میں نے دو چار وزٹ میں ہی کام تمام کرنا چاہا تھا لیکن لڑکی تعلیم یافتہ ہے اس لئے بے حد سرکش ہے، میں سمجھتا ہوں کہ معقول طریقے پر کام نہیں چل سکے گا۔ سوچتا ہوں راستے سے اٹھوا لوں، ہو سکتا ہے یہ کام آج ہی انجام پا جائے''۔

اور میں نے مسٹر بھونسلے سے رخصت کی اجازت مانگ لی تھی۔ اور وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی اور طبیعت میں انتشار تھا اور ذہن بوجھل بوجھل سا تھا۔ جانے کب مجھے اسی کرب کے عالم میں نیند آ گئی تھی۔

تب میں نے دیکھا کہ ایک لق و دق صحرا ہے، عجیب و غریب بڑا بھیانک۔ پھر میری نظر ایک حسینہ پر پڑی، ہراساں اور پریشاں۔ اس کا جسم پھول کی ٹہنی کی طرح نازک اور بے حد خوبصورت ہے، اس کی زلفیں منتشر ہیں لیکن چال میں تمکنت ہے، چہرے پر وقار ہے اور نگاہ میں پاکیزگی ہے، کچھ ہی فاصلے پر ایک دیو قامت مرد ہے۔ اس کی نگاہ میں جلال ہے لیکن پاؤں میں لغزش ہے اور منہ سے رال ٹپک رہی ہے۔ اور ٹپک ٹپک کر زمین پر جھاگ بن گئی ہے۔ یکا یک

میں نے آنکھیں ملنی شروع کیں کہ وہ مرد عورت میرے جانے پہچانے معلوم ہوئے۔ پھر میں نے انہیں پہچان بھی لیا۔ یہ حسینہ سیتا تھی اور دیو قامت مرد راون تھا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اور میرا سینہ تن گیا۔ میں نے دور ہی سے راون کی جانب تھوک دیا اور آگے بڑھ گیا۔

اور تب میں نے دیکھا کہ اس صحرا کے ایک گوشہ میں آگ کے شعلے ہیں۔ یہ شعلے آسمان کی جانب لپکتے ہیں، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن میرے قدم اسی سمت بڑھ گئے اور میری آنکھوں نے دیکھا کہ یہ شعلے ایک دراز قد مگر بدصورت، بدہیئت، کریہہ اور خوفناک مردے سے لپٹے ہیں، وہیں سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی پر پھیل جاتے ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ پھر میں نے اپنی آنکھیں ملنی شروع کیں۔ مردے کے نقوش مجھ پر روشن ہو گئے اور میرے لبوں پر فوراً آ گیا، یہ راسپوٹین ہے۔ میں نے اس کے منہ پر بھی تھوک دیا اور آگ کے شعلے اور تیز ہو گئے اور میرے قدم صحرا کی دوسری جانب ہو گئے اور تب دیکھا کہ ایک شخص محو رقص ہے اور مست ہے۔ چہرے سے مغرور ہے اور جسم کا مضبوط ہے، اس کے ہاتھوں میں آگ کی لپٹ ہے۔ جس طرف ہاتھ پھیرتا ہے چیزیں جل کر خاکستر ہو جاتی ہیں۔ یکا یک اس نے اپنا رقص موقوف کیا اور ایک معصوم سے بھولے وجیہہ شخص کے پیچھے دوڑنے لگا۔ اچانک ایک دوشیزہ نے اس کا راستہ روک لیا اور بڑی لگاوٹ کے انداز میں کہا— ''سنا ہے تم بڑا اچھا ناچتے ہو، ذرا میں بھی تو دیکھوں؟'' مغرور شخص کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آ گئی۔ اس کا چہرہ جل اٹھا، منہ کی رال جھاگ بن گئی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بڑے بھروسے کے ساتھ ایک بار پھر رقص میں محو ہو گیا۔ یکا یک اس کا اپنا ہاتھ اس کے سر پر گیا اور وہ جل کر بھسم ہو گیا۔ دوشیزہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، میں نے خاک اٹھائی تو اس دوشیزہ نے مجھ سے کہا ''یہ بھسما سور تھا''۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں، مجھ سے مخاطب ''پاروتی'' تھی اور وجیہہ بھولا شخص ''مہادیو'' تھا۔ میں نے پاروتی پر ایک تحسین کی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی کھوپڑی میرے پاؤں کے نیچے آ گئی ہے۔ میں نے گھبرا کر نظریں نیچی کیں۔ میرے سامنے ایک خوبصورت لاش تھی مگر سڑی ہوئی تھی۔ جلد کی رنگت آئینہ کی طرح صاف تھی لیکن اس میں کیڑے لگے ہوئے تھے۔ سر کے بال خوبصورت تھے لیکن ان کی جڑوں سے پیپ رس رہی تھی اور تب پھر میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ لاش کے خدوخال زیادہ نمایاں ہو گئے اور میں نے اس کی شناخت کر لی۔ یہ آہوجہ تھا۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دینا چاہا لیکن

اس کے لئے میرے منہ میں تھوک بھی نہیں تھا اور میں صحرا کے ایک دوسرے رخ کی طرف بڑھ گیا۔

اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ ہے۔ شاخِ گل کی طرح لچکتی ہے اور بھاگتی ہے۔ اس کی زلفیں لمبی، گہری اور سنہری ہیں اور گردن صراحی کی گردن جیسی ہے۔ اس کے ناخن خوبصورت اور بڑے ہیں۔ آنکھوں میں پریشانی کی لکیریں ہیں اور پاکیزگی کی لہریں ہیں۔ ناک کچھ پھیلی ہوئی ہے اس لئے اس کا پیکر مثالی ہوتے ہوتے رہ گیا ہے اور میں نے دیکھا کہ ایک موٹا تازہ بدہیئت شخص ایک خوبصورت نئی کار پر سوار ہے۔ اس کا چہرہ آبنوسی ہے اور تمازت کی وجہ سے تنور بن گیا ہے۔ منہ میں رال بھری ہے اور آنکھوں میں گناہ کے ڈورے ہیں، اب وہ اپنی کار سے نیچے آ گیا ہے اور شاخِ گل کی طرح لچکتی اور بھاگتی دوشیزہ کو پکڑنا چاہتا ہے۔ وہ بہت قریب ہو گیا۔ بہت قریب، دوشیزہ نے بپھر کر حملہ کر دیا ہے۔ اپنے خوبصورت بڑے بڑے ناخن اس کے آبنوسی کریہہ چہرے میں پیوست کر دیئے ہیں، بدہیئت مکروہ شخص بلبلا اٹھا ہے اور اس کی چیخ نکل گئی ہے۔ اس چیخ کے ساتھ ہی میری نیند ٹوٹ گئی تھی اور میں نے باقی رات جاگتے سوتے، کروٹ بدلتے گذار دی تھی۔

میں ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ میرے ملازم نے بڑے تشویشناک لہجے میں مجھے اطلاع دی— ''بابو رات تو غضب ہو گیا، بھرے راستے سے بھونسلے بابو نے رتنا دیوی کو زبردستی اپنی گاڑی میں اٹھا لیا اور بے عزتی کرنی چاہی، پر رتنا دیوی نے بھونسلے بابو کے ہی ریوالور سے انہیں ختم کر دیا، سارے شہر میں یہ بات جنگل کی آگ بن گئی ہے''۔

میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ مندر کی گھنٹیاں بجنے لگیں تھیں اور میرے قدم اسی جانب اٹھ گئے تھے۔

(مطبوعہ: ''شاعر''، بمبئی، اگست-ستمبر ۱۹۶۳ء خاص نمبر)

کوئی غم گسار ہوتا

جس دن میں پیدا ہوا تھا اس دن دھرتی ڈولی تھی۔ کتنے مکانات گرے تھے اور کتنے آدمی مر گئے تھے۔ یہ باتیں میری ماں نے مجھے بتائی ہیں۔ حالانکہ میں نے اپنی ماں سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو کیا ہوا تھا۔ میری ماں میری عمر کے برس انگلیوں پر گنتی ہے اور حساب یہاں سے شروع کرتی ہے کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو دھرتی ڈولی تھی۔ اور بہت سارے مکانات ڈھے گئے تھے۔ ان گنت آدمی مرے تھے۔ جب وہ حساب کرنے لگتی ہے تو نہ جانے کیوں مجھے بہت برا لگتا ہے۔ اور خواہش ہوتی ہے کہ ماں سے کہہ دوں کہ میری عمر کا حساب نہ لگائے۔ اس لئے کہ میں نہیں چاہتا کہ ماں کہے کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو دھرتی ڈولی تھی۔ لیکن میری خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی اور میری ماں میری عمر گنتی ہے اور مجھے سب کچھ سننا پڑتا ہے جو میں نہیں چاہتا۔ لیکن میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مثلاً میں نے اکثر چاہا کہ ماں سے پوچھوں کہ ماں تو نے میرا نام دکھی کیوں رکھا۔ آخر اس نام میں کیا رکھا تھا جو تجھے پسند آیا۔ میرا نام تو نے کرشن کیوں نہ رکھا۔ وجئے کیوں نہ رکھا۔ موہن کیوں نہ رکھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے لب ماں کے سامنے نہیں ہلتے۔ لیکن ماں سے کسی بات کی شکایت کرنا تو بہت آسان ہے۔ کم از کم مالکن سے کچھ کہنے سے زیادہ آسان تو ہے ہی۔ لیکن زبان ماں کے سامنے بھی نہیں کھلتی۔

میں کس طرح پیدا ہوا تھا میں نہیں جانتا۔ میرا باپ کون تھا میں یہ بھی نہیں جانتا۔ اس لئے کہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے ماں کی گود دیکھی۔ باپ کا سایہ نہیں دیکھا۔ ہاں جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے باپ کو ڈھونڈھا ضرور۔ ڈھونڈھنے پر ہی مجھے پتہ چلا کہ ماں سے میرے باپ کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ ایک دن ماں سے اس کی سخت لڑائی ہوئی اور وہ کہیں چلا گیا۔ پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ مجھے تعجب ہے کہ میری ماں نے کبھی اسے ڈھونڈا تک نہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اب میں پوچھنا چاہتا تھا کہ ماں بتا میرا باپ کہاں ہے؟ تیری اس سے لڑائی کیوں ہوئی؟ اگر وہ روٹھ گیا تھا تو، تو نے اسے منایا کیوں نہیں؟ اگر وہ کہیں چلا گیا

تو، تو نے اسے تلاش کیوں نہ کیا؟ لیکن یہاں بھی وہی زبان والی بات آ جاتی ہے۔ میری زبان مجھے سہارا نہیں دیتی اور دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ کاش میری زبان میری ماں سے کہہ دیتی کہ ماں تو نے مجھے پیدا کر کے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ تو نے مجھے پیٹ میں رکھا اور تیرا شوہر تجھ سے جدا ہو گیا۔ اور جب میں پیدا ہوا تو دھرتی ڈولی اور کتنے ہی آدمی مر گئے۔ کتنی بری بات ہوئی میرا ہونا۔ اور اگر واقعی میرا وجود کوئی معنی رکھتا تو میری پیدائش کے دن دھرتی نہ ڈولتی اور میرا نام دکھی نہیں ہوتا۔ میرا اپنا ایک گھر ہوتا۔ ایک باپ ہوتا۔ میرے رشتہ دار ہوتے۔ میری ماں میرے باپ کی کمائی کھاتی اور اس کا ہی گھر سنبھالتی اور میری پرورش کرتی۔ ہاں یہ درست ہے کہ میری پرورش میری ماں ہی نے کی ہے۔ لیکن اپنے گھر میں نہیں اپنے شوہر کی کمائی سے نہیں۔ میں نے تو مالکن کے گھر جنم لیا ماں کی گود میں سویا اور اس کی ہی کمائی کھائی۔ میری زبان میرا ساتھ دے تو میں پوچھوں ''ماں تو نے اس دن خودکشی کیوں نہ کر لی تھی جس دن میرا باپ تجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ماں تو نے مجھے اپنی کمائی کیوں کھلائی، میرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا..... ماں تو نے دوسروں کی ڈیوڑھی میں سونا کیوں پسند کیا، موت کی آغوش کیوں نہ پسند کی؟ لیکن میں یہ سب پوچھوں تو کیسے؟ ایسی زبان لاؤں تو کہاں سے؟

دراصل میں بچپن سے ہی کچھ ایسا ہوں۔ جو قفل میری زبان پر آج لگا ہوا ہے، بہت پہلے بھی لگا ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر دس سال کی تھی۔ مجھے یاد ہے میری ماں نے انگلیوں پر گن کر بتایا تھا کہ دھرتی کو ڈولے ہوئے دس سال ہو گئے اور میری عمر بھی دس سال ہو گئی۔ ہاں تو یہ اس وقت کی بات ہے کہ میرے ننھے سے دماغ نے سوچا کہ ماں سے پوچھوں کہ ماں جہاں ہم لوگ رہتے ہیں اس گھر سے ہم لوگوں کا رشتہ کیا ہے؟ یہ بابو لوگ کون ہیں اور مجھے تنہا چھوڑ کر تو بھیگی بھیگی سوئی سوئی راتوں میں گھنٹے دو گھنٹے کے لئے کہاں چلی جاتی ہے؟ واپسی پر تیری پیشانی پر ننھے ننھے قطرے کیوں ہوتے ہیں؟ یہ پراسرار طریقے پر آنا جانا کیا ہے؟ لیکن یہ سب سوال گھٹ کر میرے ننھے دماغ میں رہ گئے۔ میں نے کبھی نہیں کچھ پوچھا۔ ماں سے کوئی بات بھی نہیں پوچھی۔

اور ایک دن میری ماں نے اپنی انگلیوں پر حساب لگایا تھا اور اس دن چھوٹے سرکار کی جنم دن کی تقریب تھی۔ تو پیدا ہوا تھا دکھی تو دھرتی ڈولی تھی۔ بہت سے مکانات ڈھے گئے تھے۔ اس دن اور بہت سارے آدمی مرے تھے۔ چھوٹے سرکار بھی اسی تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔ پانچ برس کا فرق ہے صرف۔ دھرتی کو ڈولے پندرہ برس ہو گئے۔ پندرہ برس کا تو ہے دکھی اور دس کے چھوٹے سرکار۔ مجھے یاد ہے کتنی چہل پہل تھی اس دن، کتنے مہمان آئے تھے، کیسا کیسا سامان خریدا گیا تھا۔ باجے تاشے کا

کیسا انتظام تھا۔ شہنائیاں گونج اٹھی تھیں۔ چھوٹے سرکار نے کتنا اچھا لباس پہنا تھا۔ کتنی اچھی طرح سجائے گئے تھے۔ کتنی خوشیاں منائی گئی تھیں اس دن اور میرا جنم دن بھی تو وہی تھا۔ لیکن میرے جسم پر وہی آدھا لباس تھا۔ کوئی بات میرے لئے نئی نہیں تھی۔ بس اس کے سوا کہ اس دن ماں بار بار کہہ رہی تھی کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو دھرتی ڈولی تھی۔ میری زبان اس دن کھلتی تو میں نے ماں سے کہا ہوتا، ماں میرے لئے نیا جوڑا لا۔ میرا جنم دن ہے آج، مہمانوں کو دعوت دے، ڈھولکیں بجا، مجھے بھی سجا دے، گیت گا اور اگر یہ سب نہ ہو سکے تو بھگوان کے لئے یہ تو بھول جا کہ میں آج پیدا ہوا تھا۔ آج یعنی پندرہ سال پہلے۔ جس دن دھرتی ڈولی تھی اور بہت سارے آدمی مر گئے تھے۔

کتنی ہی باتیں تھیں پوچھنے کی ماں سے لیکن میں نہیں پوچھ پایا تھا۔ چھوٹے سرکار کی پڑھائی کا کتنا اچھا انتظام کیا گیا، انہیں اسکول بھیجا جانے لگا۔ اسکول جانے کے لئے خاص قسم کے کپڑے بنے تھے، کتابیں آئی تھیں۔ صبح شام گھر پر ماسٹر آنے لگے تھے۔ چھوٹے سرکار نے کتنی جلدی کیا کچھ نہ سیکھ لیا تھا۔ حالانکہ ماں کہتی ہے کہ میں چھوٹے سرکار سے بڑا ہوں۔ مجھے کتنی کتابیں پڑھ لینی چاہئے تھیں اب تک لیکن میرے لئے کبھی کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ مجھے اسکول تو کیا مدرسے میں بھی نہیں بھیجا گیا۔ میرے لئے کسی مولوی کا انتظام نہیں کیا گیا۔ مجھے اب تک کچھ نہیں آیا۔ کچھ بھی نہیں۔ اگر میرے منہ میں شکایت کرنے والی زبان ہوتی تو ماں سے میں پوچھتا..... بتا ماں میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا۔ تیری کوکھ اور چھوٹے سرکار کی ماں کی کوکھ میں کیا فرق ہے آخر۔ مالکن کی کوکھ کا لڑکا سرکار بنا اور تیری کوکھ کا دکھی۔ یہ سب کیوں؟ یہ سب کیوں، صرف اس لئے کہ جس دن میں پیدا ہوا دھرتی ڈولی تھی اور بہت سے..... بہت آدمی مرے تھے!

میرا جی چاہا کہ اپنی ماں سے کہوں کہ تیرے ہاتھ تو اب تھرتھرانے لگے ہیں، تیرے چہرے پر جھریاں بھی پڑ گئی ہیں، تجھے کھانسی بھی رہتی ہے، تیرا جسم تپا تپا سا رہتا ہے، پھر بھی تو صبح ہی کیوں اٹھ جاتی ہے؟ برتنوں کو صاف کرنا تیرا ہی کام کیوں ہے؟ تیرے لئے ڈاکٹر کیوں نہیں آتا؟ تجھے دوا کوئی نہیں کھلاتا، تیرے لئے تو اچھی غذا کا انتظام نہیں ہے۔ تو آرام کیوں نہیں کرتی، تو، تو بیمار لگتی ہے ماں؟ تجھے کام تو ایک دم نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن تو اب بھی سب کچھ کرتی ہے۔ تجھے مالک لوگ یہ سب کرنے سے روکتے کیوں نہیں؟ وہ تیری بیماری کو محسوس کیوں نہیں کرتے؟ لیکن یہ سب سوالات دماغ ہی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ لب پر نہیں آتے، بالکل نہیں آتے۔

اور کل ماں نے اپنے کھانستے ہوئے گلے سے اور تھرتھراتی ہوئی انگلیوں پر پھر حساب

لگایا.....جب دھرتی ڈولی تھی تو، تو پیدا ہوا تھا، وہ سب لوگ پریشان تھے، مکانات ڈھے جا رہے تھے، آدمی مر رہے تھے۔ پچیس سال ہو گئے دھرتی کو ڈولے۔ تو بھی پچیس سال کا ہو گیا دکھی۔ اور میں سوچنے لگا کہ میں پچیس سال کا ہو گیا تو کیا ہوا۔ چھوٹے سرکار پچیس سال کے ہو جائیں گے تو بہت کچھ ہو جائے گا۔ ابھی وہ بیس سال کے ہی تو ہیں اور کیا کچھ ہو گئے۔ انہوں نے ایم.اے کر لیا ہے، نئی کار بھی خرید لی ہے۔ ایک جگہ محبت بھی کر رہے ہیں۔ نئی نوکرانی بھی رکھ لی ہے۔ اس سے ہنس کر بولتے بھی ہیں.....اور ماں نے پھر کہا اور کھانسی کے درمیان کہا، بیٹا چھوٹے سرکار کہتے ہیں تو چنیا سے شادی کر لے بڑی اچھی لڑکی ہے، بہت سندر ہے۔ اس گھر میں تو بھی رہے گا اور تیری چنیا بھی۔

اور مجھے ایسا لگا کہ ماں کو آگے کچھ نہ کہنے دوں اور کہہ دوں کہ ماں چنیا نے بھی تیری ہی راہ اختیار کی ہے۔ تو بھی تو کبھی جوان تھی، تیرا بھی تو کوئی شوہر تھا لیکن کہاں ہے تیری جوانی؟ کہاں ہے تیرا شوہر؟ ماں چنیا بھی بھیگی بھیگی سوئی ہوئی راتوں میں گھنٹے دو گھنٹے کے لئے کہیں جانے لگی ہے۔ واپسی پر اس کی پیشانی پر بھی ننھے ننھے قطرے ہوتے ہیں۔ ماں میں اس کا شوہر ہو گیا تو میری اس سے لڑائی ہو جائے گی اور میں بھی کہیں چلا جاؤں گا اور اس کی کوکھ بھی تیری طرح ایک لڑکے کو جنم دے گی جس کا نام دکھی ہی طرح کچھ ہو گا۔ شاید اسے بدھوا کہا جائے۔ ہو سکتا ہے اس کی پیدائش پر بھی دھرتی ڈولے۔ اور پھر اس کے لبوں پر بھی اپنی ماں سے پوچھنے کے لئے سینکڑوں سوالات ہوں گے اور شاید وہ بھی کوئی سوال نہ پوچھ سکے گا۔ نہیں ماں میں شادی نہیں کروں گا۔ نہیں کروں گا۔ نہیں کروں گا ماں۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''شاعر''، بمبئی، افسانہ نمبر ۱۹۶۲ء)

ستی ساوتری

میرے سامنے ایک مختصر سا خط ہے، لیکن اس اختصار میں کیسا سیلاب ہے کہ مجھے بہائے لئے جاتا ہے۔ بہت تیز رفتار سے، بہت دور۔ اس باڑھ کے پانی میں عجیب خوشبو ہے۔ محبت کی خوشبو ہے۔ خلوص کی گرمی ہے۔ سانسوں کی مدہوش کن آنچ ہے۔ تو یہ مختصر تحریر کیا نہیں ہے میرے لئے، یہ الفاظ جن میں شہد کی مٹھاس ہے، کبھی مجھے کڑوے لگے تھے، بے حد کڑوے۔ لیکن یہ کیسا انقلاب ہے کہ تلخی شیرینی بن گئی ہے۔ وجہ پریشانی باعث راحت ہے۔

''آپ چلے گئے، لیکن آپ کی یاد نہ جا سکی۔ وہ میرے لئے زندہ رہی، دل میں مقفل رہی۔ بڑی قیمتی امانت کی طرح، بلکہ زندگی کی طرح! ہر خزاں بہار کا پیغام بن کر آئی اور فریب دے کر چلی گئی۔ لیکن فریب مسلسل بھی امید کو گھائل نہ کر سکا اور میں جیت گئی۔ ہائے نہ میں مر جاؤں تو کیا کروں کہ آپ آ رہے ہیں۔ ایسی مسرت میں کیسے سنبھال سکوں گی میرے سرتاج!''

ہاں! یہ روحی انور لکھ رہی ہے۔ پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکی ہے۔ آج میں کتنا بدل گیا ہوں، بالکل بدل گیا ہوں۔ پہلے ایسے خطوط بے حد عامیانہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک دم بازاری، جن سے دل کڑھ جاتا تھا اور اُداس ہو جاتا تھا۔ لیکن یکا یک مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اتنا جذباتی ہو گیا۔ روحی کے جملے مجھے سنبھالا دیتے معلوم ہو رہے ہیں۔ مجھے مسرور کر رہے ہیں۔ آج یہ الفاظ آنسوؤں کے موتی معلوم ہوتے ہیں۔ روحی کے آنسو، جن کی قیمت اب بہت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے تو ایسی بات نہ تھی۔ پچھلے دنوں تک تو روحی ایسی نہ معلوم ہوتی تھی۔ پچھلے دنوں تک تو میں.... میں....

اور کیا روحی کے ساتھ میرا رویہ غلط تھا کہ روحی زیبا نہ تھی۔ کیا مقابلہ ہو سکتا ہے دونوں میں؟ زیبا کی شرابی آنکھیں روحی کو میسر نہ تھیں۔ باب بیئر کی خوبیوں سے روحی واقف نہ تھی۔ اسے لپ اسٹک کا استعمال معلوم نہ تھا۔ اس پر لباس کی تنگی کا حسن آشکارانہ تھا۔ وہ اپنی رفتار میں کوئی مصنوعی مگر قاتل انداز پیدا کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی۔ اتنا ہی نہیں، زیبا کی جلد کی رنگت سے چاندنی شرماتی تھی۔ اور روحی..... اور روحی..... خیر جانے دیجئے۔

تو میرا رویہ روحی کے معاملے میں کیا غلط تھا؟ خلوص ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ ستی ساوتری بن جانا ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ میں کہ ایک شاعر، حسن کا دلدادہ، آرائش کا پرستار، ترقی پسند.....تو روحی میری ذہنی سطح سے بہت نیچے تھی جو میری شاعرانہ صلاحیتوں کو گہنا تو سکتی تھی، جلا نہیں بخش سکتی تھی۔ میرے لئے مرنے کو تیار تھی لیکن میری زندگی نہیں بن سکتی تھی.....اور زیبا؟ تب میں فورتھ ائیر میں اردو آنرز میں تھا۔ کلاس سے نکلتے ہی ایک مترنم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرا گئی تھی۔

''مسٹر انور!'' یہ تھرڈ ائیر کی سائیکلوجی کی طالبہ زیبا تھی۔

''آں، آں!'' میں ہکلایا تھا۔

''کل ہی ماہنامہ ''نوح'' میں آپ کی نظم ''مجھے بھول جاؤ!'' پڑھی تھی۔ بڑے امکانات ہیں آپ کے۔ فن پر ایسی قدرت جوان شعراء کو کم نصیب ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے''۔ زیبا نے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ دیں.....پھر ہم لوگ ملنے لگے تھے۔ زیبا کتنی پروگریسیو تھی۔ جتنی حسین اتنی ہی کلچرڈ۔ اس کی ماڈرن باتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کا باب ہیئر بہت دلکش تھا۔ وہ لپ اسٹک لگانے کا آرٹ جانتی تھی۔ ہنسنے میں فن برتتی تھی۔ ڈریسیز کے حسن انتخاب اور استعمال کے گر سے واقف تھی۔ وہ ہری ہری گھاس پر لیٹ کر میرے کیمرے کے لئے حسین پوز دے سکتی تھی۔ یہاں تک کہ..... یہاں تک کہ میری شاعری کو اپریشیٹ کر سکتی تھی۔ ایسے میں روحی کے ساتھ میرا رویہ غلط تھا تو کیسے؟

آج تین سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے پاپا نے ٹیلی گرام دے کر علی گڑھ سے بلا لیا تھا اور میرے احتجاج کے باوجود روحی سے میری شادی کر دی تھی۔ روحی سے پہلے میرا کوئی سابقہ نہ تھا۔ اس کے شب و روز سے میں واقف نہ تھا۔ پھر بھی میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا تھا۔ میرے اردگرد تاریکی گہری ہو گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ پندرہ دنوں تک زہر کے گھونٹ پیتا رہا۔ اور اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ماڈرن زندگی سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ شوہر کو سرتاج کہتی ہے۔ بھاری بھرکم لباس میں لپٹی رہتی ہے۔ نقرئی اور طلائی زیورات کے بوجھ تلے دبی رہتی ہے۔ اسے لباس کے موزوں ناموزوں ہونے کا حال معلوم نہیں۔ وہ اپنے لمبے بالوں کی آرائش تک نہیں کر سکتی۔ اسے مذہبی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ وہ فرائڈ سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ مجھے شاعر تو سمجھتی ہے لیکن اسے میرے نماز نہ پڑھنے پر تعجب ہے۔

اور میں پھر زیبا کے پاس علی گڑھ واپس چلا گیا تھا۔ گھر پر میرے ساتھ جو ناٹک ہوا تھا اس کی تفصیل اسے بتادی تھی۔ لیکن زیبا روحی تو نہ تھی کہ ایک زبردستی کے واقعے کو کوئی اہمیت دیتی۔ اس کی ترقی پسندی سے مجھے سہارا ملا تھا۔ ڈھارس بندھی تھی۔ پھر دن گزرتے گئے۔ روحی کے نقوش میرے ذہن و دماغ سے حرفِ غلط کی طرح مٹتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی بری سی شبیہ ابھر بھی آتی تھی جب روحی کا کوئی ایسا خط ملتا تھا۔

''یہ درست ہے کہ میں آپ کے قابل نہیں لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اتنی بات تو شاید آپ مان لیں گے کہ میں شرعی طور پر آپ کی شریک حیات بن چکی ہوں۔ تو مجھے موقع دیجئے کہ میں اپنے کو تبدیل کر سکوں، آپ کے قابل بنا سکوں۔ ایک بار میری جان کی قسم! آجایئے سرتاج!''

ایسی تحریریں مجھے بے حد گھناؤنی لگتی تھیں۔ بہت قبیح معلوم ہوتی تھیں۔ میں تو کلب کا رسیا تھا، رقص و سرود کی محفل کا عاشق تھا۔ نئی امنگ اپنے میں پاتا تھا۔ تو ان باتوں کے لئے زیبا ہی زیب دیتی تھی۔ جو جب گاتی تھی تو ایک عالم حیرت مجھ پر طاری کرتی تھی۔ میری بانہوں میں جھول کر مجھے نئے رقص سے آگاہ کرتی تھی۔ جس کے لبوں کی شیرینی مجھے زندگی کی حلاوت بخشتی تھی اور.....اور.....

تو میرا یہ اقدام کیسے غلط ہو سکتا تھا، جب میں نے روحی کو لکھ دیا تھا:

''تمہاری اور میری راہیں قطعی الگ ہیں۔ تمہارے آنچل کے سائے میں ایسی تاریکی ہے کہ میرا دم گھٹتا ہے۔ اور ہم دونوں زندگی کے ایک ایسے موڑ پر ہیں جہاں بدل بھی نہیں سکتے۔ اس لئے تمہارا مجھے فراموش کر دینا ہی درست ہوگا۔

تمہیں یہ خبر بھی دے دوں کہ میں علی گڑھ میں زیبا نامی ایک زندگی کی تحریک سے بہت جلد دائمی رشتہ جوڑ لوں گا''۔

لیکن مجھے نفرت بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ روحی نے میری ایسی صاف صاف باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا اور جواب میں وہی ''سرتاج'' کی رٹ تھی۔

اب مجھے روحی سے نفرت نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟

لیکن مجھے آج کیا ہو گیا ہے۔ روحی مجھے بڑی مظلوم معلوم ہو رہی ہے۔ میری اپنی نظر آ رہی ہے۔ یکا یک اتنی قربت کیسے ہو گئی؟ یہ میرا دماغ بدل کیسے گیا۔ سوچنے کا انداز نئے سانچے

میں کیونکر ڈھل گیا۔ ہائے اب تو جی یہ چاہتا ہے روحی کے قدموں سے لپٹ جاؤں۔
انہیں آنسوؤں کے سیلاب سے دھوڈالوں۔
معافی مانگوں۔
حالانکہ روحی کے محبت بھرے خطوط خوشبو میں لپٹے مجھے پہلے بھی ملے تھے۔ کئی خطوط ملے تھے۔

لیکن تب زیبا.....
تب تو زیبا ایسی نہیں تھی!
بالکل ایسی نہیں تھی!!

وہ زیبا جس کے پیکر کا سارا راز مجھے معلوم تھا۔ جس کے جسم کے تمام خطوط میرے مطالعے میں رہے تھے۔ کسی ڈاکٹر جمیل سے ہم آغوش یہ کہتے ہوئے سنی گئی تھی.....

''انور تو نرا چغد ہے!..... نرا چغد!!..... میں تو کب سے اسے بے وقوف بنا رہی ہوں!!!''

(مطبوعہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، جولائی ۱۹۶۳ء، افسانہ نمبر)

ایک سایہ

دس برس کے بعد آج اس کھڑکی کے پیچھے ایک سایہ لہرا کر رہ گیا ہے اور میں نے اسی لمحہ اپنی نظریں پھیر لی ہیں۔ پردے کے پیچھے کیا ہے؟ کون جانے کیا ہے؟ ساون کے اندھوں کو ہر جگہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت کتنی تلخ ہوتی ہے! کتنی تلخ!!

یہ کالج کے دنوں کی بات ہے۔ اس وقت ذہن کا نہاں خانہ گہوارۂ حسن و جمال تھا۔ جہاں قبح کی سمائی ممکن نہ تھی۔ دماغ رنگ و بو کا ایک گلشن بنا۔ زندگی کو سرتاسر خوشبو تصور کرنے پر مجبور تھا۔ ہونٹوں سے موسیقی سی جھڑ جاتی تھی۔ بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔

تب مجھے رومانی داستانیں بہت لطف دیتی تھیں۔ محبت کے عامیانہ قصے دلکش معلوم ہوتے تھے، حسن رہ گزر مسحور کرتا تھا۔ ہر نظر محبت کی نظر معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت میں بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ انگریزی کی عشقیہ نظمیں نوٹوں کی مدد سے بڑے چاؤ سے پڑھتا تھا۔ اختر شیرانی کی کتنی ہی نظمیں ازبر کئے ہوئے تھا اور مجاز کی نظم ''آوارہ'' سے متاثر ہو کر لیونڈر کی خوشبو میں لپٹا کلکتہ کی چورنگی میں زیرلب گنگنایا کرتا تھا۔ یا کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل..... یکا یک کسی جنس لطیف کا جسم بے خیالی ہی میں مس ہو جاتا تو میرا جی یاد آجاتے تھے..... کہ ایک خنجر اتار ڈالوں.....

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک رات میں کافی دیر سے ہوٹل لوٹا تھا۔ ابھی میں زیرلب گنگناتے ہوئے اپنا کوٹ ہینگر میں لٹکا ہی رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بلوا بھیجا۔ اس رات میری بڑی انسلٹ ہوئی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کافی ڈانٹ پلائی تھی، میرے کردار کو مشکوک بتایا تھا۔ اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی تھی، کیریئر کا قصہ اٹھایا تھا اور کھلے الفاظ میں وارننگ دی تھی۔ میں کہ اس وقت ایک طائر لاہوتی تھا، ایسی پابندی کو ننگ پرواز تصور کرتا تھا، اس لئے چند ہی دنوں بعد میں پارک اسٹریٹ میں منتقل ہو گیا جہاں میں آزاد تھا۔ بالکل آزاد۔

میرے نئے کمرے کے سامنے ایک شاندار عمارت کھڑی تھی جس کی ایک کھڑکی میری

نگاہوں کے سامنے پڑتی تھی۔ میں اپنے نرم و گداز بستر پر لیٹا فراق کی عشقیہ شاعری پڑھتا رہتا اور کنکھیوں سے کھڑکی کی جانب دیکھتا جاتا۔ ایسے عمل سے زندگی کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا، شاعری دوآتشہ ہو جاتی تھی، پھر میں کھڑکی کے اس پار اپنی نظروں کے تیر پھینکتا تھا، کھڑکی کا پردہ پاسبان بن جاتا تھا۔ کوئی راز ظاہر نہ ہو پاتا تھا۔ ایسے میں خیال اور محض خیال پردے سے چھن کر دور نکل جاتے تھے اور نتیجہ ہمیشہ رنگین معلوم ہوتا تھا۔ بے حد رنگین۔

اور ایک دن ہوا نے شوخی کی تھی۔ پردہ ذرا سا سرک گیا تھا۔ میرے سامنے ایک عالم روشن ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی باتیں کتنی سچی ہوتی ہیں۔ میرے سامنے ایک دوشیزہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ میں نے اپنا دل تھام لیا تھا اور پھر میں نے اپنی تسلی آپ ہی کر لی تھی۔ کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے۔ میں نے اپنی آرائش و زیبائش میں مزید اضافہ کیا تھا۔ کھڑکی کے عین سامنے گلدان سجائے تھے۔ نیم عریاں امریکی کلنڈروں سے اپنے کمرے کی دیواروں کو آراستہ کیا۔ فلمی گانے ترنم کے ساتھ قدرے زور سے گانے لگا تھا۔ اور ان کے اثرات معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا۔

ایک شام ایسی ہی بے چینی میں کھڑکی کے سامنے کھڑا مترنم آواز میں پڑھ رہا تھا:

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یکا یک کھڑکی کا پردہ پورا کا پورا سرک گیا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے قیامت کا سامان تھا۔ پھر میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بج گئی تھیں — ''اے مسٹر آپ بہت اچھا گاتے ہیں، پھر سنایئے تو''۔ میں ابھی شش و پنج ہی میں تھا کہ کھڑکی کا پردہ درست کر دیا گیا۔

اس کا چہرہ دودھ میں دھلا ہوا تھا۔ آنکھیں روشن اور بڑی بڑی تھیں۔ ناک واضح اور نوکیلی تھی۔ بال انگریزی وضع کے چھوٹے لیکن بے ترتیب اور الجھے ہوئے تھے۔ اتنا کچھ تو میں نے دیکھ لیا تھا، میرے ذہن نے بقیہ پیکر اپنے طور پر مرتب کر لیا تھا جو بعد میں بالکل صحیح ثابت ہوا تھا۔ وہ سرو قد تھی۔ پورے جسم کی ساخت پر کشش تھی۔ کٹیلی، لچکیلی۔

''اے مسٹر آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔ ایک بار پھر سنایئے گا''۔ یہ جملہ بہت دیر تک میرے کانوں میں موسیقی انڈیلتا رہا تھا، بہت دیر تک۔ اسی رات کو میں نے اپنے بالوں کے لئے برل کریم خریدی تھی۔ ایوننگ اِن پیرس سینٹ حاصل کیا تھا۔ اپنے پرانے سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے ایک نکٹائی اونچی قیمت کی لی تھی اور اس کے لئے ایک سنہری کلپ بھی خریدی تھی۔

میں بازار سے جلدی ہی لوٹ آیا تھا لیکن نیند رات گئے تک نہیں آئی تھی۔

پھر کھڑکی کا پردہ برابر ہی سرکتا رہا تھا اور ہر بار میرے لئے کچھ نہ کچھ سامانِ نشاط فراہم کر جاتا تھا۔ وہ مجھ سے اب گفتگو کر لیتی تھی۔ لیکن اس کی گفتگو میں کوئی ربط نہ ہوتا تھا۔ ''اے مسٹر آپ عورت ہیں کہ مرد''..... ''او جناب آپ کی ٹائی مجھے بہت اچھی لگتی ہے، مجھے دیجئے میں لگاؤں گی''..... ''اے صاحب آپ مجھے دیکھ کر مسکراتے کیوں ہیں؟'' میں ابھی ایسے وار سنبھال بھی نہ پاتا کہ وہ قہقہہ لگانے لگتی تھی۔ پھر کھڑکی کا پردہ گر جاتا تھا اور میں خیالات کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو جاتا تھا۔ حسن بے پروا کے اس انداز نے مجھے اپنے بارے میں زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ میں دن بھر اپنی سج دھج میں لگا رہتا تھا۔ اب میں اپنے کوٹ میں تازہ گلاب لگانا نہ بھولتا تھا۔

اور ایک دن کھڑکی کا پردہ کہیں کہیں سے چاک کر دیا گیا تھا۔ میں ابھی اپنے دل میں اس کی طرح طرح سے تاویل کر رہا تھا اور ہر تاویل مجھے مسرور بنا رہی تھی کہ یکا یک وہ کھڑکی کے سامنے آ گئی تھی اور بہت سنجیدگی سے مسکرائی تھی۔ پھر اس نے میرے سامنے ایک پھول پھینک دیا تھا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے اردگرد نظریں ڈالی تھیں، پھر وہ پھول اپنے کوٹ میں لگا لیا تھا اور نظریں ایک بار پھر کھڑکی کی جانب اٹھائی تھیں۔ وہ چاند اب تک وہیں تھا۔ میں نے موقع مناسب جانا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پا کر کہہ دیا تھا ''آپ بے حد حسین ہیں''۔ میرے اس جملے پر وہ شرمائی نہ تھی۔ کھڑکی کے پھٹے ہوئے پردے میں اپنے چہرے کو چھپانے کی کوشش نہ کی تھی، وہاں سے بھاگی نہ تھی۔ وہ اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ پھر بولی تھی—

''میں حسین ہوں تو آپ کیا ہیں؟ آپ حسین ہیں تو میں کیا ہوں۔ آپ حسین ہیں اور میں بھی حسین ہوں تو بات کیا ہے؟ بتائیے نا یہ سب کیا ہے؟''

پھر جیسے اس پر قہقہہ کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی اور میں بے وقوفوں کی طرح اس کا منہ تک رہا تھا۔ پھر وہ اسی طرح قہقہہ لگاتے کھڑکی سے الگ ہو گئی تھی۔

میرے دماغ نے اس کے تمام سوالات کی منطقی توجیہہ کر ڈالی تھی اور ان میں ایک رومانی ربط تلاش کر لیا تھا۔ ''میں حسین ہوں تو آپ کیا ہیں؟'' معاً مجھے ایسا محسوس ہوا تھا، آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جاؤں اور اپنے تندرست اور جوان پیکر کا ایک بار پھر جائزہ لوں۔ حسن کی طرف سے حسین ہونے کی سند ملی تھی۔ میرا سینہ خوشی سے تن گیا تھا۔ پھر— ''آپ حسین ہیں تو میں کیا ہوں!''۔ میں تھوڑی دیر کے لئے الجھا تھا لیکن فوراً الجھے ہوئے تار سلجھ گئے تھے۔ میرے دل نے

کہا تھا، حسن کی ایسی خاکساری اچھی نہیں۔ واقعی آپ کا میرا کیا مقابلہ۔ اس کے بعد — ''بات کیا ہے؟'' یعنی یہ کہ ''یہ سب کیا ہے؟'' میرے دل نے مجھ سے کہا تھا کہ حسن کو اتنا الجھانا اچھا نہیں۔ صاف صاف لفظوں میں کہہ دینا ہے کہ یہ محض کھیل نہیں۔ ہمیں واقعی ایک ساتھ جینا اور مرنا ہے، ہمیں اپنا ایک گھر بنانا ہے۔ ایک گھر اور اپنا گھر۔ آیئے ہم عہد کریں، آیئے ہم قسم کھائیں''۔ اس رات میں انٹونی اور کلوپٹرا دیر تک پڑھتا رہا تھا۔ محبت کے فلسفہ کو شیکسپیئر سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا۔ کس نے اس سے زیادہ سمجھا ہے آخر!

پھر ایک دن کھڑکی کے پیچھے جیسے کوئی ہنگامہ ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شیشے کے برتن توڑ رہا ہے۔ پھر ایک آواز اُبھری..... شاداں! اے شاداں! یہ سب کیا کر رہی ہو۔ اس کے بعد فضا ساکت ہو گئی، بالکل ساکت! میں بہت دیر تک کچھ اندازہ لگاتا رہا۔ مزاجِ یار برہم ہے!

اس واقعہ کے بعد کئی روز تک کھڑکی کا نیا پردہ نہیں سرکا تھا۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا تھا۔ میرے دل نے کہا تھا حسن مجبور ہے، حسن پر پہرے ہیں، اس پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ افسوس کہ مجھ میں ڈون کوئیزوٹ بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ تب میں کیا کر سکتا تھا۔ واقعی میں کیا کر سکتا تھا؟

میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کھڑکی کا پردہ ہٹ گیا۔ اس کی آنکھیں سوجی سی تھیں۔ جیسے کئی راتیں اختر شماری میں کٹی ہوں۔ میں نے زور سے کہا:

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

لیکن اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں آیا، ہونٹوں پر تبسم نہیں آیا۔ پھر اچانک اس نے ایک بڑا آئینہ اٹھا لیا اور اچانک ہی میری طرف اسے پھینک دیا۔ میرے پاؤں کے سامنے اس کے ٹکڑے بکھر گئے اور میں جلد جلد نہ جانے کیوں انہیں چننے لگا کہ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرا گئی — ''معاف کیجئے گا، شاداں میری بہن ہے۔ ایک عرصہ سے پاگل ہے، ہر وقت توڑ پھوڑ کرتی رہتی ہے۔ دیکھئے نا آئینہ آپ کے کمرے میں پھینک دیا ہے۔ معاف فرمایئے''۔ مجھے یہ جملے تیر کی طرح لگے۔ شیشہ کا ایک ٹکڑا میری انگلی میں چبھ گیا۔

اس کھڑکی پر پڑے ہوئے پردہ سے اُبھرنے والا حسین سایہ میرے ذہن و احساس پر مدتوں چھایا رہا۔ (مطبوعہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، افسانہ نمبر، جولائی ۱۹۶۵ء)

سکنڈ سیکس

''اپنی شکل تو دیکھئے، آئینے میں کیسے لگتے ہیں آپ''۔

''تو تم ہی بتاؤ کیسا لگتا ہوں میں''۔

''کیسے لگتے ہیں؟..... بالکل برے''۔.....ذرا اپنی ناک پر انگلی رکھ کے دیکھئے، لگتا ہے منہ کے ذرا اوپر بط کی گردن ہے.....اور آنکھیں تو بہ ہے، لگتی ہیں بیل کی ہیں، اور پیشانی، ہائے اللہ یہ تو سر کے حصے میں گھسی جارہی ہے''۔

''اور یہ سینہ اسے دیکھ کے تو بس پتھر کی سل کا گمان ہوتا ہے''۔

''تو تمہارے آگے میں یہی کچھ ہوں جو تم نے کہا.....لیکن یہ سب تو میری تعریف ہوئی۔ تم دوسرے لفظوں میں کہنا چاہتی ہو کہ میری ناک ماشاء اللہ اونچی ہے، آنکھیں بڑی بڑی ہیں، پیشانی چوڑی ہے، اور یہ کہ میرا سینہ ایک جوان اور صحت مند مرد کا سینہ ہے''۔

''یہ تو محض خوش فہمی ہے''۔

''نہیں یہی حقیقت ہے''۔

''غلط، جھوٹ''۔

''صحیح، سو فیصدی صحیح''۔

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''بہت سارے ثبوت ہیں''۔

''ایک بھی تو پیش کیجئے''۔

''لیکن تم جلنے لگو گی''۔

''میں کیوں جلنے لگی''۔

''میں کہتا ہوں پہلے سوچ لو''۔

''خوب سوچ لیا.....ثبوت پیش کیجئے بات بنانے سے کام نہیں چلے گا''۔

''میں اگر حسین لڑکیوں کے خطوط پیش کروں تو؟''

''یعنی''۔

''یعنی یہ کہ جب میں خوش قسمتی سے کنوارا تھا اس وقت میں تمہاری جنس میں کتنا مقبول تھا۔ اس کا حال تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کتنی ہی لڑکیاں میرے پیچھے دوڑتی تھیں اور میں ان سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا..... کتنوں کی خوابوں کا میں راز رہا..... کتنوں نے مجھے.....''۔

''بس چپ بھی رہئے..... ایسا دعویٰ تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ زبان سے اپنے کو کوئی کرشن کہے تو اس میں کیا دھرا ہے''۔

''لیکن میں نے کہا میں خطوط پیش کروں گا''۔

''خطوط کیا خط ہی پیش کیجئے نا''۔

''اس وقت نہیں کل صبح''۔

''کل صبح نہیں اسی وقت''۔

''ڈھونڈھنا پڑے گا''۔

''تو ڈھونڈھئے پھر''۔

''اس وقت موڈ نہیں، رات زیادہ ہوگئی ہے''۔

''موڈ ٹھیک نہیں ہے تو سو جایئے''۔

''سو جاؤں؟..... دل سے کہہ رہی ہو''۔

''اور کاہے سے کہہ رہی ہوں''۔

''روشنی بہت تیز ہے''۔

''تو گل کر دوں؟''

''کر دیجئے نا''۔

''آٹھ بج رہے ہیں..... اٹھئے نا''۔

''ابھی نہیں اٹھتا''۔

''اب اٹھئے بھی..... دفتر چھوڑنا ہے کیا''۔

''رات بھر جگاتی ہو اور صبح ذرا دیر تک سونے نہیں دیتی''۔

''میں جگاتی ہوں کہ آپ''۔

''تم جگاتی ہو کہ میں''۔

''خود تو.....خود تو کوئی بحث لے کے بیٹھ جاتے ہیں.....دکھایئے خط.....''۔

''کیسا خط.....خوب بھول گئے نا.....اور وہی خط جن میں کسی نے آپ کے حسن پر قصیدہ فرمایا ہے''۔

''بہت جل کر بول رہی ہو.....ابھی جب یہ حال ہے تو خط دیکھ کر کیا کیا کرو گی''۔

''کچھ بھی کروں آپ کو کیا.....آپ پہلے دکھایئے تو''۔

''دفتر سے آنے پر''۔

''تو پکی رہی''۔

''ہاں پکی رہی''۔

''میں کہتا ہوں تم ضد سے باز آجاؤ.....تم عورت ہو اور عورت کا دل میں خوب سمجھتا ہوں''۔

''یہ تقریر کی جگہ نہیں ہے.....میں اپنے دل سے واقف ہوں''۔

''آپ خط بلا پس وپیش دکھایئے''۔

''تو پھر میرا ذمہ نہیں''۔

''اچھی بات ہے.....پیش کیجئے''۔

''تو پڑھتا ہوں''۔

''پڑھیے''۔

''جان ودل سے پیارے''۔

''القاب بازاری ہے''۔

''خیر، جو کچھ ہے یہی ہے''۔

''تو آگے پڑھیے''۔

''محبت بھرا سلام''۔

تو کیا ''پیارے'' کو نفرت بھرا سلام صاحبہ لکھتیں''۔

''بیچ میں مت بولو.....ورنہ میں پڑھنے کا نہیں''۔

''خط میرے حوالے کیجئے.....میں خود پڑھ لوں گی''۔

''احتیاط سے پڑھنا.....غصے میں پھاڑ نہ دینا''۔

''اُف بہت ہوا اب دیجئے بھی''۔

''شروع سے پڑھتی ہوں''۔

''پڑھو''۔

''روپ نگر، ۱۷/اپریل ۵۸ء

بارہ بجے رات۔

جان ودل سے پیارے!

محبت بھرا اسلام

جانے آپ انسان ہیں کہ پتھر.....آپ کے سینے میں دل بھی ہے کہ نہیں.....اتنی بھی بے نیازی اچھی نہیں، اتنا بے نیاز تو خدا بھی نہیں ہے.....آپ کو اپنے حسن پر ناز ہے، یہاں تک تو ٹھیک ہے، لیکن یہ ناز ''فخر'' کی منزل چھو رہا ہے جو ٹھیک نہیں ہے.....کیسے کہوں کہ اب آپ کے بغیر میں ایک پل بھی جی نہیں سکتی.....آپ میری منزل ہیں.....اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے میں اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی ہوں۔ اللہ قسم جب سے آپ کو دیکھا ہے.....رات کی نیند اڑ سی گئی ہے.....کبھی خواب دیکھتی ہوں تو بس آپ ہی کو دیکھتی ہوں''۔

''خوب، نیند جب اڑ گئی ہے تو پھر لیلیٰ خواب کیسے دیکھتی ہیں''۔

''جملہ بازی بند کرو.....آگے پڑھو''۔

''ہاں تو کہاں تک پڑھ چکی تھی''.....ہاں یاد آیا کبھی خواب دیکھتی ہوں تو بس آپ ہی کو دیکھتی ہوں.....کہ کوئی خبر تک نہیں لیتے''۔

''کیوں مجنوں صاحب آپ لیلیٰ کی خبر کیوں نہیں لیتے''۔

''اس طرح کروگی تو خط پھاڑ دوں گا''۔

''اچھا آگے پڑھتی ہوں.....آگے ہے کہ.....آپ اس طرح بے نیازی سے کام لیں گے تو میں زہر کھالوں گی.....اور میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ اتنا ظلم نہ کیجئے مجھے اپنا بنانے کی سبیل نکالئے۔ میں آپ کے چرنوں کی داسی بن کر رہوں گی۔''

''ایسا لگتا ہے کوئی فلم دیکھنے کے بعد خط لکھا گیا ہے.....''چرنوں کی داسی''.....بہت خوب''۔

''تم خط ٹھیک سے پڑھو گی کہ نہیں''۔

''پڑھ تو رہی ہوں..... میں آپ کے چرنوں کی داسی بن کر رہوں گی..... آپ مجھے سہارا دیجئے۔ مجھے اپنے والدین سے ڈر نہیں، محلے والوں سے ڈر نہیں..... سماج سے ڈر نہیں، میں کسی سے نہیں ڈرتی..... بس آپ کی ایک ہاں پر میری زندگی و موت کا مدار ہے..... آپ اگر خاموش رہے تو میں جان دے دوں گی..... یہ میرے آخری الفاظ ہیں..... کیا خط کے جواب کی امید رکھوں۔

— آپ کی اپنی زہرہ جبیں، ایم.اے''۔

''لیکن نفس مضمون اور انداز تحریر سے لڑکی نن میٹرک معلوم ہوتی ہے''۔

''لیکن تم سے لاکھ درجے بہتر ہے''۔

''سو تو میں بھی دیکھ رہی ہوں''۔

''اب جلو نہیں، بتاؤ ثبوت تمہیں مل گیا نا..... ایسے ایسے سینکڑوں خطوط میرے پاس ہیں..... سب ہی دکھا سکتا ہوں''۔

''لیکن خط سے کوئی بات تو نہیں بنتی۔''

''یعنی!''

''یعنی یہ کہ اس سے یہ تو پتہ نہیں چلا کہ آپ حسین ہیں''۔

''لیکن لڑکیوں نے جو خطوط لکھے ہیں''۔

''خطوط لکھے ہیں تو کیا ہوا..... اگر کسی نے کسی کو کوئی محبت بھرا خط لکھ دیا تو وہ حسین ہو گیا''۔

''تو کیا ہوا''۔

''کچھ نہیں ہوا، جیسا ہے ویسا ہی رہا''۔

''اس زبردستی کا تو کوئی جواب نہیں ہے..... خط دیکھنے کے بعد تم قائل ہو گئی ہو..... دل کی بات یہی ہے''۔

''میرے متعلق کیا خیال ہے آپ کا''۔

''یہی کہ تم حسین نہیں ہو''۔

''لیکن مجھے بھی تو حسین لڑکوں نے خط لکھے ہیں''۔

''یہ تو محض کہنے کی باتیں ہیں''۔

''نہیں اس میں سو فیصدی حقیقت ہے''۔

''کبھی یہ بات حقیقت نہیں ہو سکتی''۔

''ہمیشہ یہ بات حقیقت رہے گی''۔

''اچھا تو دکھاؤ خط''۔

''دکھاؤں گی کبھی اتنی جلدی بھی کیا ہے''۔

''نہیں تمہیں ابھی دکھانا پڑے گا''۔

''نہیں دکھاتی''۔

''اب دکھاؤ بھی، بحث مت کرو.....اس طرح پریشان کرنے سے کیا فائدہ''۔

''میں پریشان کہاں کر رہی ہوں، آپ ہی تو ضد کر رہے ہیں.....مجھے ڈر لگتا ہے آپ مرد ہیں اور مرد کا دل.....''۔

''بھاڑ میں جائے مرد اور اس کا دل.....تم خط دکھاؤ''۔

''دیکھئے آپ کا تیور بدل رہا ہے''۔

''میں کچھ نہیں جانتا، بتاؤ خط کہاں ہے''۔

''کل دفتر سے آنے پر دیکھئے گا.....اتنی سی بات مان لیجئے، میری قسم''۔

''خیر.....''۔

''آپ سوتے کیوں نہیں''۔

''سو ہی تو رہا ہوں''۔

''کہاں سو رہے ہیں''۔

''چپ رہو، نیند کیوں خراب کر رہی ہو''۔

''میں نیند کیوں خراب کرنے لگی''۔

''عجیب تمہاری زبان ہے، چلتی ہی جاتی ہے''۔

''بہت سویرے اٹھ گئے''۔

''تو کیا ہوا.....یہ بات بھی پوچھنے کی ہے''۔

''لیکن یہ بات کچھ غیر متوقع سی ہے''۔

''غیر متوقع سی ہے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ گیا''۔

''میں کیا جانوں پر کوئی وجہ تو بہر حال ہوگی ہی''۔

''تم تو بال کی کھال کھینچتی ہو.....۵ بجے کیوں اٹھا؟ ۹ بجے تک کیوں نہ سوتا رہا.....آخر اتنی پوچھ مات کاہے کی ہے''۔

''یوں ہی پوچھتی ہوں''۔

''مت پوچھا کرو''۔

''آخر آپ اس طرح بگڑ کیوں رہے ہیں''۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں بگڑ کہاں رہا ہوں''۔

''خیر چھوڑیئے.....ناشتہ تیار کرنے میں دیر ہو رہی ہے.....''۔

''میں آج ناشتہ باہر ہی کروں گا''۔

''لیکن کیوں؟''

''میں ہر بات کی وجہ نہیں بتا سکتا''۔

''خط دکھادوں تو''۔

''تو کیا.....دکھاؤ خط''۔

''وہ تو آپ کی پتلون کی جیب میں ہے''۔

''جیب میں ہے.....اچھا''۔

''زور سے پڑھئے''۔

''شرم نہیں آتی تمہیں..... پڑھتا ہوں زور سے—

''صدق پور

۸ر مئی ۵۷ء

اچھی روشن!

ہزار دعائیں

تمہارے خطوط کا جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جتنی تم حسین ہو اتنے ہی حسین تمہارے خطوط بھی ہوتے ہیں..... تمہیں یاد ہوگا جب کبھی بھی تمہارے چہرے سے میری نظریں ٹکرائی ہیں بس وہیں گم ہو کر رہ گئی.....سو یہی حال تمہارے خطوں کا ہے۔ کیا کہوں

کہ تمہارے لکھے ہوئے الفاظ میرے ذہن و دماغ کو کس طرح مسحور کرتے ہیں..... بار بار پڑھتا ہوں، کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تب جا کے تسکین ہوتی پھر جواب دینے بیٹھتا ہوں تو دماغ قلم کا ساتھ نہیں دیتا۔ نہ میرے پاس اتنے الفاظ ہیں نہ تمہارا اندازِ تحریر.....

روشو..... اب اس طرح ہم لوگ کب تک آنکھ مچولی کھیلا کریں گے..... جی چاہتا ہے کہ یہ رسمی دیواریں ڈھ جاتیں اور تم اپنی زبان سے میرے کانوں کو اپنے شیریں الفاظ سے مسحور کرتی، اور پھر میں تمہارے اتنا ہی قریب ہو جاتا کہ..... اتنا کہ..... خیر یہ باتیں میں نے جذباتی بن کر نہیں لکھی ہیں..... اس کے آگے مجھے کچھ لکھنا بھی نہیں ہے، سوچ کر جواب دو۔

— صرف تمہارا مسعود

''تو یہ ہے تمہاری محبت کی داستاں، میری بیوی اور طوائف میں کیا فرق ہے.....''۔

''ہائے اللہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں''۔

''قبل اس کے کہ میں کچھ کر گذروں..... تم''۔

''جی میں نے محض خط دکھایا ہے، جس طرح آپ نے''۔

''قیامت ہے یہ برابری..... جی چاہتا ہے کہ یہ سب دیکھنے سے قبل میں مر جاتا''۔

''مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ تم آج ہی میکے چلی جاؤ''۔

''پتلون کی داہنی جیب میں ایک خط اور ہے''۔

''کیا کہا.....!''

''جی ہاں..... ایک خط اور ہے۔

''تو یہ خط بھی''۔

''لائیے میں پڑھتی ہوں..... سرتاج!''

''آج تین بجے شب میں آپ نے بقلم خود اپنے حسن کا قصیدہ لکھا ہے اور میں پڑی دیکھتی رہی ہوں۔ جب آپ سو چکے ہیں تو میں نے بھی اپنے حسن کا قصیدہ بقلم خود بنام خود لکھا اور پھر یہ خط لکھ رہی ہوں..... یہ خط اس لئے کہ آپ مرد ہیں..... میں آپ کی کسی کمزوری اور محبت کو برداشت کر سکتی ہوں۔ آپ نہیں کر سکتے، سچ ہے نا یہ بات.....

(مطبوعہ: ماہنامہ ''صنم''، پٹنہ، ستمبر ۱۹۵۸ء)

ایک نقش جاوداں

کچی عمر میں آئینہ دیکھنا بس آفت ہے۔ ذرا حیا شرم ہو تو کاہے کو کوئی تھوڑی دیر بھی سامنے ٹک سکتا ہے۔ کمبخت جلدی جلدی کیسی کیسی باتیں بتانے لگتا ہے۔ ایسی ایسی باتیں کہ توبہ بھلی۔ کوئی شرم سے پانی پانی نہ ہو جائے تو کیا ہو۔ کہنے کو تو بے جان شیشہ ہوتا ہے پر ایکدم سے سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اب چہرے پر سرخی دوڑنے لگے، آنکھیں خمار آلود ہو جائیں، تنفس کا زور بڑھ جائے، انگڑائی سی آنے لگے تو بھاگ کر پلنگ پر اوندھی گر جانے کے سوا چارہ بھی کیا رہ جاتا ہے۔ لیکن بھاگنے کے بعد بھی سکون مل جائے تو ایک بات ہو۔ بھلا آئینہ کی الٹی سیدھی باتیں کبھی ذہن سے ماؤف ہو سکتی ہیں۔ تو یہ آئینہ ہی کی شرارت تو تھی کہ بھیگے بالوں کو تولیہ سے نچوڑتے یہ خیال آ گیا تھا کہ ذرا چھت پر چڑھ کر پڑوس کے ماحول کا جائزہ لیا جائے۔ بھلا ان دنوں کانوں سے کھینچے جانے کا ڈر بھی رہتا تھا۔ ممی کی ہزار ڈانٹیں ایک طرف اور اپنی روش ایک طرف۔ اب چھت پر جاتے ہی نیا کھیل شروع ہو گیا تھا تو اس میں بھی میری ادھ کچری عمر اور آئینہ ہی کا قصور تھا۔ یوسف صاحب کچھ ایسے حسین تو نہ تھے کہ میں روایتی زلیخا بن کر ان کا دامن پکڑ لیتی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی پر واہیات ہی تو معلوم ہوتی تھیں۔ قد کی لمبائی ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ ذرا رنگت بھی تو سرخ و سفید ہو، تو اسے نا آزمودہ کار کی بیوقوفی کہئے کہ وہ بھائے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ باتیں یہیں پر ختم ہو جاتیں تو اختر شماری اور شب بیداری کی نوبت نہ آتی۔ یوسف کی نظریں جو مجھے ٹٹولنے لگیں تو شرم و حیا کے احساس کے باوجود نگوڑی مسکراہٹ دانتوں اور ہونٹوں کے درمیان مچل گئی، اگر ایسا نہ ہوتا تو دل کی دھڑکنیں رنگین اور خوشبودار لفافے میں بند نہ کی جاتیں۔ ہائے اوائل عمر کی جرأتیں کیا کیا رنگ لاتی ہیں، پھر تو دھڑکنیں داستانیں بن گئیں، وہ تو خیر ہوئی کہ دیا سلیقے کی عورت تھی، ورنہ کیا خط و کتابت ہی تک معاملہ رہتا۔ کمبخت گھاگھا ایسی کہ قدم قدم پر نصیحتیں کرتی جاتی اور ہم دونوں کے درمیان بیچ کی کڑی بھی بنی رہتی۔ اب جو حالات کا جائزہ لیتی ہوں تو لگتا ہے وہ محض نمک کا حق ادا کر رہی تھی ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ میرے ان کے ملنے میں دیوار بن جاتی اور کئی موقعوں پر محبت اور ہمدردی کے باوجود دل کڑھا دیتی۔ کیسے کیسے

نازک مرحلے آئے اور وہ کس کس طرح انہیں ٹالتی رہی۔ اب سوچتی ہوں کہ دیا نہ ہوتی تو کیا ہوتا، کیا انور صاحب کے قدموں کی خاک بھی بن سکتی تھی میں۔ ان دنوں کیا نہیں ہے میرے پاس، انہوں نے کیا نہیں دیا ہے۔ صرف بڑے بزنس مین رہتے تو بڑی بات نہ تھی۔ اللہ رے ان کی نہ ختم ہونے والی محبت۔ جیسے میں ان کی ساری زندگی تو ہوں۔ پیسوں کی فراوانی اور پیار کے سیلاب میں بس بہی جاتی ہوں۔ کوئی کنارہ بھی ہے ان کی محبت کا۔ کوئی حد بھی ہے پیسوں کی۔ جوانی میں خطوط کے کھیل کو جو، اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے بڑی بھول کی تھی۔ زندگی کی سب سے بڑی بھول۔ بھلا ہم ہندوستانی عورتوں کو پیار محبت سے کیا واسطہ۔ ہماری محبت تو واقعی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے جو مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔ اس سے پہلے کچھ کرنا گناہ سے کیا کم تھا۔ لیکن تب ایسا گناہ بھی کتنا مزہ دے گیا تھا۔ عجیب لطف تھا اس میں، کچھ گھبراہٹ، کچھ سکون، کچھ خوف، کچھ ہمت، کچھ پا جانے کی ہوس، کچھ کھو دینے کا ڈر۔ میں کیا پاتی یا کیا کھوتی یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے لیکن وہ رات تو بھولتی ہی نہیں جب ممی نے ایک خط پڑھ لیا تھا۔ جی ایکدم سے چاہا تھا کہ دھرتی پھٹ جاتی اور میں سما جاتی۔ شرم سے عرق عرق ہوگئی تھی، پاؤں میں جیسے منوں گیلی مٹی لگ گئی تھی، اس پر طرہ ممی کی دبی دبی ڈانٹیں، وہ ان کی گھٹی گھٹی سی صلواتیں۔ یہ بات ممی تک محدود رہ جاتی تو زندگی کا کچھ مطلب ہوتا، اس خوف سے تو ہوش وحواس منتشر تھے کہ ابا کے کانوں میں باتیں آ گئیں تو میں ان سے کیسے منہ دکھا سکوں گی۔ وہ رات تو روتے اور جاگتے کٹ گئی تھی، لیکن صبح ہی ممی نے ڈانٹ پلائی کہ رونا دھونا ختم نہ ہوا تو وہ سارے کرتوت کا بھانڈہ ابا کے سامنے پھوڑ دیں گی۔ اس وقت اس ڈانٹ نے کتنا سہارا دیا تھا۔ یکلخت جی چاہا تھا کہ ممی کی گردن سے لپٹ جاؤں اور ایک بار اور پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ بات آئی گئی ہوگئی تھی۔ مگر ممی بھی کیسی جہاندیدہ تھیں۔ ایکدم سے فیصلہ کر بیٹھیں کہ بس جلد سے جلد میرے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ عبلڑکوں کی ایسی قلت بھی کہاں تھی۔ میرے حصے میں آئے بھی تو انور صاحب جیسے محبت کے پیکر..... جس کے یہاں غم نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ جیسے ذہین ویسے ہی خوبصورت۔ دولت تو ان کے ورثہ کی چیز رہی تھی۔ ایسے میں یوسف صاحب سے ان کا کیا مقابلہ ہوسکتا تھا۔ مانا کہ وہ ایک عرصہ کے بعد پٹنہ کالج میں تاریخ کے پروفیسر ہوگئے تھے، اس وقت محض طالب علم ہی تو تھے وہ۔ آج پچیس سال کی مدت ہوگئی لیکن باتیں سب کی سب یاد ہیں، جیسے کل ہی کی ہوں۔ تو جب میں مایوں میں تھی تو یکا یک خیال آیا کہ یوسف صاحب کے خطوط جلا دیئے جائیں۔ یہ سانپ سے کم نہیں ہیں۔ کبھی نہ کبھی ضرور ڈس لیں گے۔ پر جیسے ہی آگ جلائی آنکھوں میں آنسو آ گئے، ہاتھوں میں لرزش سی ہوگئی۔ کتنا جی کڑا کرنا پڑا

تھا اس وقت۔ حد ہے بھلا، جب کاغذات جل کے خاک کی ڈھیر ہو گئے تو ایسا لگا کہ ان کا سرمہ بنا لوں۔ پاگل پن میں اسے آنکھوں سے لگائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ اب جب یہ سب باتیں یاد آ جاتی ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ کچی عمر میں بعض باتوں پر آدمی کا بالکل اختیار نہیں رہتا ہے۔ اب تو بے بی کے بارے میں انور صاحب پریشان ہیں تو یہ بالکل درست ہے، میں جب برقعے میں بند تھی تو کیسی کیسی عجیب وغریب حرکتیں کر بیٹھی تھی، وہ تو خیر سے کالج میں پڑھتی ہے، بی.اے پاس کر چکی ہے۔ گو کہ ابھی اس کا اٹھارہواں ہی سال ہے لیکن شادی تو ایک دن ہونی ہی ہے، پھر دیر کا ہے کی۔ یہ عمر بھروسے کے قابل ہرگز نہیں ہے اور اس وقت جب لڑکی پردہ بھی نہیں کرتی ہے۔ کہیں اونچ نیچ ہو گئی تو ناک کٹ جائے گی۔ لیکن کوئی سلیقے کا لڑکا بھی تو ملے۔ صرف پڑھا لکھا ہونا ہی بے بی کے اچھے مستقبل کی ضمانت نہیں ہے۔ ذرا گھرانہ تو ڈھنگ کا ہو۔ لڑکے والوں کے پاس پیسے اتنے ہوں کہ بے بی ذرا آرام سے رہ سکے۔ پھولوں کے سیج پر پلی ہے۔ وہ کیا جانے مفلسی کس کو کہتے ہیں اور تکلیف کیا ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ڈیڈی بھی عجیب ہیں، رشتہ بھی کرنا چاہتے ہیں تو کیسے کیسے لوگوں کے یہاں۔ اسی مہینہ کی بات ہے..... کہنے لگے شفیق بڑا ہونہار شاعر ہے، مانا کہ اس کے پاس دولت نہیں ہے لیکن ذہن بڑا رسا پایا ہے۔ تندرست اور خوبصورت بھی ہے، بائیس کی اتنی سی عمر ہے، لیکن عقل وفراست میں بڑے بوڑھوں جیسے تیور ہیں اس کے۔ بھلا بے بی کو نرا شاعر کے پلے باندھ دینا کیسی زبردست بھول ہوگی۔ پھر کچھ دنوں پہلے ایک دوسرا رشتہ لے آئے تھے۔ بولے جمیل میرے دوست نفیس کا بڑا نیک اور صالح لڑکا ہے، ابھی ایم.اے نفسیات کا طالب علم ہے۔ نفیس خود یونیورسٹی میں حساب کے پروفیسر ہیں۔ آدمی ذرا خراچ اور دوست نواز ہیں اس لئے آمدنی وخرچ برابر سمجھو، توبہ اب اپنی لڑکی ایسی بھی بھاری کاہے کو ہونے لگی کہ ایسے گھر میں بیاہ دی جائے جہاں اس کے عیش وآرام کی کوئی سبیل ہی نہ ہو۔ لیکن آج..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ رشتہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بے بی کے ڈیڈی کہنے لگے پٹنہ کالج کے تاریخ کے پروفیسر مسٹر یوسف میرے کلب کے ساتھی ہیں۔ بڑے مخلص اور باغ وبہار آدمی ہیں۔ پیسہ تو ان کے پاس بھی نہیں ہے لیکن ان کا لڑکا جاوید جو ایم.اے اردو میں ہے، بڑا سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔ بے بی کے لئے بڑا مناسب رہے گا۔ جانے کیا ہوا کہ ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ اب کتنا رشتہ کاٹتی رہوں میں۔ بے بی کی قسمت جانے..... شادی تو کسی سے کرنی ہی ہے، کر دیں بے بی کے ڈیڈی، جاوید سے شادی۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''صنم''، پٹنہ، جنوری ۱۹۶۳ء)

سنہری زلفیں

اسے آج پھر ایسا محسوس ہوا جیسے واقعی فردوس کی سرزمین میں محوخرام ہو۔ یہاں کی تمام تر رعنائیاں اس کے دل کی اتھاہ گہرائی میں جذب ہوتی جارہی تھیں۔ خوشبو کی ہر لہر اس کے دماغ کی تمام رگوں میں جولانی بھر رہی تھی۔ باغ کے رنگین اور شگفتہ پھول اس کے دل میں طرح طرح کی کہانیاں گڑھ رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ یہاں کی ساری فضا عطر کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ گاؤں کا یہ باغ فردوس کا ٹکڑا ہے، جہاں کی ہر چیز مکمل ہے۔ یہ فردوس ایک مکمل فردوس ہے۔ سبک خرام ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کے دماغ کو مس کرتا ہوا روح میں پیوست ہو گیا۔ اس نے خود سے سوال کیا کہ اس کے جسم کے اندر ایک شاعر رنگین نوا کی روح تو نہیں؟ جو ہواؤں کے جھونکوں سے بدمست ہو جائے اور عجیب وغریب باتیں حسین اور دلکش باتیں سوچنے پر ذہن و دماغ کو آمادہ کرے۔ وہ محض افسانہ نگار ہے، کہانیاں لکھ سکتا ہے لیکن یہ شعری کیفیت اس پر کس طرح طاری ہو رہی ہے۔ نزدیک ہی سے ایک بھونرا اڑا اور اس کے کان میں کچھ کہتا ہوا دور بہت دور پرواز کر گیا۔ یک بیک اس کے تصور نے ایک دوسرا موڑ لیا۔ کیا فردوس ہی کی طرح دوسرے تمام گاؤں میں امن وسکون ہے۔ فردوس تو اسم بامسمیٰ ہے۔ کسی شاعر نے اس کا نام رکھا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ہر چیز فرحت بخش ہے۔ مسرت آگیں ہے۔ یہ خوشبو کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ یہاں رنج والم کہاں؟ یہاں تو محبت کی گنگا جمنا بہتی ہے۔ یہاں سادگی ہے، سادگی اور پرکاری۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا اور وہ بھونرا، اس کا ذہن سوچنے لگا۔ جہاں پھول ہیں وہاں بھونرے بھی ہیں۔ جہاں خوشی ہے وہاں غم بھی ہے۔ جہاں اچھائی ہے وہاں برائی بھی ہے۔ جہاں فردوس ہے وہاں.....وہ آگے بھٹک سا گیا۔ اس طرح ہر بات کو کلیہ بنانا ٹھیک نہیں۔ یہ بات تو مضحکہ خیز ہوگی کہ جہاں فردوس ہے وہاں دوزخ ہے۔ جہاں فردوس ہے وہاں صرف فردوس ہے اور یہ گاؤں تو ہر لحاظ سے فردوس ہے۔ یہاں کے باشندوں کے دلوں میں خلوص ہی خلوص ہے۔ محبت ہی محبت ہے۔ فریب، نفرت یہ ساری چیزیں ان کے لاشعور میں بھی نہیں۔ وہ باغ سے نکل چکا

تھا۔سورج آسمان کے پردوں میں گم ہونا چاہ رہا تھا۔اس کے دامن کی رنگینی دور دور تک پھیل رہی تھی۔اس کی نگاہیں یکا یک مغرب کی جانب اٹھیں۔اس نے دیکھا آکاش کا احمریں دامن زمین پر لوٹ رہا ہے۔آج آسمان اور زمین بغل گیر ہو رہے تھے، روز ہی ہوتے ہوں گے لیکن اس نے آج ہی دیکھا ہے۔فردوس میں آکر۔شہر کے ہنگاموں میں کس کو فرصت ہے کہ آسمان کی طرف دیکھے۔اس کی نظر ایک بار پھر سورج کی طرف بھاگی۔آسمان زمین کے گلے سے اب تک لپٹا ہوا تھا۔کیا آسمان زمین ایک ہو سکتے ہیں۔نظر بھی کتنی سبک ہوتی ہے۔ہر قدم پر فریب کھاتی ہے۔ آسمان وزمین کا ملنا بھی تو فریب نظر ہے۔جانے کیوں اس کا دل بجھ سا گیا۔فضا میں دھندسی چھا گئی۔گاؤں تاریک سا ہو گیا اور وہ اب تصورات کی دنیا بسائے گھر لوٹ گیا۔اپنے دوست کے گھر۔صرف دو روز تو اور رہنا تھا اسے یہاں۔پھر وہی شہر کی پر تکلف زندگی، بھیڑ چال، ہنگامہ۔

ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے دوبے کے ذہن کی تخلیق کے بارے میں عجیب وغریب التزام برتا ہوگا۔بہت سارے متضاد عناصر فراہم کئے ہوں گے۔پھر انہیں باضابطہ حل کیا ہوگا۔ تب جا کے ذہن بنا ہوگا۔یہ بات صرف کہنے کے لئے نہیں کہی گئی۔واقعہ بھی یہی ہے۔دوبے نے کہیں ایک پھول دیکھا اور اس کے چہرے پر ہزاروں پھول کھلے۔اتنا مسرور ہوا کہ جیسے دنیا بھر کا خزانہ اس کے پیروں تلے ڈال دیا گیا ہو۔کہیں خوشی دیکھی تو یہ بھول گیا کہ یہاں کبھی غم کا منظر بھی پیش نظر ہو سکتا ہے۔کہیں غم دیکھا تو اس کے جسم کی تمام رگیں آہ وزاری کرنے لگیں۔جیسے انگ انگ کے انبساط کے سوتے خشک ہو گئے ہوں۔کہیں سے محبت کی ایک بوند اسے ملی۔اس نے کوشش کی کہ خلوص کی گنگا سے اپنے مخلص کو غسل دے۔کہیں سے نفرت کا گمان ہوا تو وہاں اس کی ساری کریہہ صورتیں جمع کر دیں۔دوبے کی سیمابی طبیعت اس کے احباب کے لئے کبھی تکلیف دہ، کبھی فرحت بخش ثابت ہوتی اور اس طرح وہ خوشیوں اور آہوں سے آنکھ مچولی کھیلا کرتا۔ فردوس کی پرسکون فضا، یہاں کی کھلی ہوا، سادہ زندگی اسے بھائے بغیر نہ رہی۔یہاں کی تر وتازہ ہواؤں کا سحر اس کے دماغوں پر ایسا چھایا کہ وہ اس کے دوسرے رخ کی طرف بھول کر بھی نہ سوچ سکا۔یہاں اسے دکھی دادا ملے جو اسے اپنی جوانی کے ہوش ربا قصے حقے کی لے پر سناتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے۔اپنے سن وسال سے اتنے بے نیاز کہ دوبے کو حقہ بڑھانے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے۔یہاں اسے دھاری بساؤ ملے جو اپنی بیٹی کی مہورت کے ہنگامے میں بھی اسے نہیں بھولے اور ضد کر کے کھانے پر اسے اپنے یہاں لے ہی گئے۔اسے یہاں بوڑھی دیا ملی جو محض

اس اظہار پر کہ سر میں درد ہے، گھنٹوں اپنی کمزور انگلیوں سے اس کے دماغ کے گودوں سے درد نکالتی رہی۔ اسے یہاں گوری دھوبن ملی جو ہر تیسرے دن اس کے تمام میلے کپڑے دھو کر دے جاتی اور پیسوں کا کوئی حساب نہیں کرتی۔ یہاں اسے اَن گنت گوریاں اور کنواریاں دیکھنے میں آئیں جن کے نازک لب کو کبھی مصنوعی میک اَپ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، جن کے گلاب سے رخسار غازہ و پاؤڈر کے بار کے کبھی متحمل نہیں ہوئے۔ جن کی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی زلفیں کبھی فتنہ انگیزی پر مائل نہیں ہوئیں۔ جن کی مست جوانیاں کبھی بدمست نہیں ہوئیں۔ ان کے پائل کی جھنکار کسی تال و سر کی پابند نہیں ہوئی۔ جن کے مسحور کن رقص سے محظوظ ہونے کے لئے اسے کبھی جیب ہلکی نہیں کرنی پڑی۔ دوبے کو فردوس میں یہ سب کچھ ملا۔ اس کی طبیعت اس پر کیف فضا سے ہم آہنگ ہوئے بغیر نہ رہی۔ شہر کے شور و غوغا اور مصروف زندگی میں اسے ہزاروں عیب نظر آنے لگے۔ وہ اسے دوزخ سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوا اور فردوس تو فردوس ہے۔ ہر گاؤں کی فضا ایسی ہی ہوتی ہوگی۔ دوبے یہ سب کچھ سمجھنے پر مجبور تھا۔ اسے اب تک وِجے جی سے ملاقات نہ ہوئی تھی جس کے کھلیان میں کسی نے آگ لگا دی تھی جس سے سارا دھان جھلس کر خاک ہو گیا تھا۔ وہ اب تک بابوراؤ سے نہ مل سکا تھا جن کی زمینداری چھن گئی تھی، جن کے چولہے میں دن بھر میں ایک ہی بار آگ لگتی تھی، جن کی پانچ بیٹیوں کے لئے بَر چاہئے تھا۔ اُونچے گھرانے کا۔ اسے ہنوز للوا چمار سے واسطہ نہ پڑا تھا جو ہر روز اپنی بھوکی بیوی کو تاڑی پی کر نشے میں موٹے ڈنڈے سے مار مار کر اَدھ موا کر دیتا۔ اسے ابھی گنگا رام سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی جو اسے اپنے پلنگ پر بیٹھنے تک نہ دیتے۔ اس لئے کہ وہ برہمن ہیں اور دوبے برہمن نہیں۔ اسے اس کی خبر نہیں ہے کہ اکثر راتیں یہاں چوروں اور ڈاکوؤں کے ڈر سے جاگ کر بتائی جاتی ہیں۔ اسے اس کا علم نہیں کہ کبھی آسمان کے آنسو اتنے خشک ہو جاتے ہیں کہ ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں ٹپکتا اور آسمان کے اس غم میں فردوس کے سارے باشندے سوکھ کر ٹاٹ ہو جاتے ہیں۔ اسے کیا معلوم کہ آسمان کبھی اتنا روتا ہے کہ اس کا اثر فردوس کے اکثر مکانات پر پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے مکیں سمیت زمین دوز ہو جاتے ہیں۔

دوبے کے علم میں اب تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ نوجوان لڑکی جس کے بال بھورے ہیں، جسے کوڑھ نے اپنے آغوش میں بری طرح دبوچ لیا ہے، سونا رام کی اکلوتی بیٹی ہے، جو بیٹی کا علاج نہیں کراتا، جس کے پاس بہت پیسے ہیں انبوہ۔ اس طرح دوبے تصویر کے ایک رُخ سے تو آگاہ ہوا لیکن دوسرے رُخ کی طرف اس نے توجہ نہیں کی۔ اس کے اندر کا افسانہ نگار بار بار سوچنے

پر یہ مجبور ہوا کہ آخر قدرت نے اسے شاعر کیوں نہیں بنایا۔ وہ یہاں کی ہر چیز کو اشعار کے پیکر میں ملبوس دیکھنا چاہتا تھا۔ جسے وہ شہر کے ہنگاموں کی لے پر گنگنا سکتا۔ ویسے فردوس کی حسین شے اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔ اس کا ذہن پک رہا تھا، کتنی ہی کہانیاں ہر موڑ پر اسے رقص کرتی، تھرکتی، گنگناتی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن طبیعتاً وہ المیہ کردار کا خالق تھا۔ یہاں بھی اس کے آب و گل کے متضاد عناصر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ دوبے متاثر تو ہوتا ہے رنگینیوں سے، اور خالق ہے المیہ کہانیوں کا۔ اب تک تو اس کے قلم سے کتنی ہی کہانیاں اُبل پڑتیں، لفظوں کے کتنے ہی پیکر بن جاتے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اس لئے کہ حزن و یاس کے جزویات فردوس میں عنقا تھے۔ کہانی جنم نہیں لے رہی تھی۔ فردوس کے باغ میں وہ محض بھونرے سے متاثر ہوا۔ بھونرے کے کردار نے کئی عنوان اس کے ذہن کو دیئے مگر محض عنوان سے کیا ہوتا ہے۔ ہاں دوبے اس لڑکی سے بھی متاثر ہوا تھا جس کے بال بھورے ہیں، جس کا حسین جسم کوڑھ کی نذر ہو چکا ہے۔ ایک کہانی اس کے ذہن میں مچلی۔ ہو سکتا ہے اس کہانی کی شبیہ بھی اس کے ذہن میں بن گئی ہو۔ بہر حال اسے سونا رام سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جس کے پاس ابنوہ پیسے تھے، ابنوہ۔ لیکن وہ اپنی خوبصورت بیٹی کا علاج نہیں کرتا۔ کوڑھ کا ہاتھ مضبوط ہو رہا تھا۔ باپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ اگر دوبے کی سونا رام سے ملاقات ہو جاتی تو اس کے ذہن میں پکی ہوئی کہانی ایک دم پک جاتی اور پک کر پھوٹ جاتی اور گھاؤ کے پیپ کی طرح کاغذ پر بکھر جاتی اور فردوس کچھ گھناؤنا ہو جاتا اور وہ آج ہی شہر چلا جاتا۔ لیکن سونا رام اسے نہیں ملے۔ کہانی شاید پوری نہیں پکی اور کل دوبے کو شہر لوٹنا ہے اور آج فردوس کی شام اسے کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی۔

دوبے کو آج کی شام کچھ دھندلی نظر آئی اور دنوں سے زیادہ باغ کا رخ کرتے ہی اس نے لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے حسین بال کو بھی، اس کے جسم کے کوڑھ کو بھی۔ اس کا ذہن غیر متوازن سا ہو گیا۔ باغ کچھ اچھا نہ لگا۔ موڈ کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا۔ گاؤں کے مکانات میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ اس کے دماغ کے چراغ کی لو دھیمی دھیمی سی تھی۔ جانے کیوں یکا یک دوبے نے سوچا کل اسے گاؤں چھوڑ دینا ہے۔ آج طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں نہ طبیعت سنبھال لی جائے۔ سامنے ہی ایک گاؤں نظر آ رہا ہے۔ وہاں کتنے ہی چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ جیسے اشارہ کر رہے ہوں، جیسے اشارے سے بلا رہے ہوں اور دوبے کے قدم اس گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ فردوس کتنا اچھا گاؤں ہے۔ سب ہی گاؤں اچھے ہوتے ہوں گے۔ یہاں سب

لوگ خوش ہیں۔ کیسا کیسا بے پناہ حسن ہے۔ بے پرواہ سا۔ اور وہ لڑکی بھی حسین ہے لیکن کوڑھ کا مرض ہے۔ وہ جلدی جلدی راستہ طے کرنے لگا۔ اب وہ دو گاؤں کے درمیان تھا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ کھیتوں کے ناہموار راستوں سے اس کے پاؤں آگاہ نہ تھے اور تاریکی تھی کہ بڑھتی چلی جارہی تھی۔ مینڈھیں غیر کشادہ سی تھیں۔ اس کے پاؤں اکثر اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا۔ راستے اتنے تنگ کیوں ہیں، مینڈھیں اتنی کشادہ کیوں نہیں بنائی جاتیں۔ دوبے کو اب تک یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ ان مینڈھوں کے لئے اکثر جانیں تلف ہوتی ہیں۔ شہر کی مصروف زندگی نے اسے کبھی موقع نہیں دیا تھا کہ وہ یہ جانتا کہ محض مینڈھوں پر موٹی مٹی کی تہہ لگانے سے اکثر کسان جھگڑ پڑتے ہیں۔ پانی کا رخ ایک کھیت سے دوسرے کھیت کی طرف موڑنے پر اکثر گردنیں کاٹ لی جاتی ہیں، کٹوالی جاتی ہیں۔ دوبے کے ذہن میں اس وقت صرف اتنا تھا کہ یہ مینڈھیں کشادہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ اب وہ دو مواضعات کے درمیان تھا۔ اس نے پلٹ کے فردوس کی طرف دیکھا۔ فردوس میں جگہ جگہ ستارے ٹنکے ہوئے نظر آتے جگمگ کرتے ہوئے۔ کتنا اچھا منظر ہے۔ اس نے دل میں کہا اور اپنے قدم کو آگے بڑھا دیا۔ راستہ اب انتہائی دشوار گذار ہو رہا تھا۔ لیکن دوبے کو وہاں پہنچنا ہی تھا جہاں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ اسے اشارے سے بلا رہے تھے۔ وہ چلتا رہا۔ کبھی کبھی کتے کے بھونکنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا جاتی۔ لیکن سمت کا پتہ نہ چلتا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ کبھی اس کے پاؤں تلے متحرک شئے آجاتی۔ وہ جھٹ چھلانگ لگا کر آگے بڑھ جاتا۔ دوبے گاؤں پہنچ چکا۔ یہ گاؤں فردوس نہیں تھا۔ یہ گاؤں اس کے لئے نیا تھا۔ دو چار کتے اس کے آگے پیچھے لگ گئے، بھونکنے لگے۔ دوبے نے انہیں ڈانٹنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھونکتے رہے۔ دوبے کو شہر کے بلڈاگ یاد آگئے۔ ساتھ ہی ان کے بارے میں عمارتوں سے ٹنگی ہوئی تختیاں بھی۔ Beware of the Dog۔ اگر بلڈاگ اپنے گلے کی قیمتی زنجیروں سے الگ ہو جاتے، پھر وہ کتنے ہی کو کاٹ کھاتے۔ لیکن یہ گاؤں کے کتے ہیں۔ انہیں صرف بھونکنے سے مطلب ہے، کاٹنے سے نہیں۔ دوبے اَب گاؤں میں داخل ہو چکا تھا۔ کتا اس کے جسم سے لپٹ جاتا۔ وہ زیورات کی ایک چھوٹی مختصر سی دوکان کے نزدیک آگیا۔ دوکان سے ایک شخص نے کتے کو ڈانٹا۔ کتے نے اپنا ارادہ موقوف کر ڈالا۔ یکا یک دوبے کے کان سے آواز ٹکرائی ''دوبے بابو آپ یہاں؟'' دوبے نے دیکھا دوکاندار فردوس کا کوئی شخص ہے۔ صورت آشنا، نام سے اَب تک آگاہ نہیں تھا۔ دوبے بابو آپ شاید مجھے پہچان نہیں رہے ہیں۔ قبل اس

کے کہ وہ کچھ کہتا، دوکاندار نے آگے بڑھ کر دوبے کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور دوکان میں لے آیا۔

یہ میری دوکان ہے۔ میرا نام سونا رام ہے۔ میں فردوس میں ہی رہتا ہوں۔ سورج نکلتے ہی یہاں چلا آتا ہوں۔ پھر رات کو گھر چلا جاتا ہوں۔ آپ جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اس کے بغل ہی میں تو میرا مکان ہے۔ دوبے نے اپنی اس ملاقات پر مسرت کا اظہار کیا۔ ضروری رسمی باتیں شہری انداز میں پوچھیں۔ اسے رَہ رَہ کر یہ خیال ہو رہا تھا کہ اس کے بغل والے مکان میں تو وہ لڑکی رہتی ہے جس کی زلفیں سنہری ہیں اور جسے کوڑھ کا مرض ہو گیا ہے۔ کیا وہ سونا رام کی بیٹی ہے۔ سونا رام پر دوبے کو ترس آنے لگا۔ سونا رام ہنس ہنس کر باتیں کرتا جاتا ہے۔ دوبے کو اس کی ہنسی کچھ مصنوعی سی معلوم ہوئی۔ بار بار وہ اس ادھیڑ بن میں تھا کہ آخر وہ کس طرح اس لڑکی کے متعلق دریافت کرے۔ پھر یہ بات کچھ مسرت آگیں تو نہیں کہ ایسے موقع پر پوچھی جائے۔ دوبے کا دل دھڑکتا رہا اور سونا رام کہتا رہا۔ اس گاؤں کا نام سیتا پور ہے۔ پہاڑی جگہ ہے۔ اکثر دور دراز کے لوگ یہاں چلے آتے ہیں۔ پہاڑ دیکھنے کی تو سبھوں کی خواہش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ دوکان کر لی ہے۔ نئے بیاہے جوڑے کبھی اِدھر بھٹک کر آجاتے ہیں تو پھر کچھ میرا چل جاتا ہے۔ آپ جیسے لوگ تو بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ شوقین لوگ زیور خرید لیتے ہیں۔ کہئے دوبے بابو آپ یہاں کیسے آئے؟ سونا رام باتونی تھا۔ کاروباری باتونی ہوتا ہی ہے۔ اس نے سیتا پور کی تفصیل دوبے کو بتادی تھی۔ دوبے یہ سب کچھ سن کر خوش نہیں ہوا۔ وہ دوسرا فردوس دیکھنا چاہتا تھا۔ سیتا پور فردوس نہیں تھا۔ یہ تو بہت کچھ شہر کا روپ لئے ہوئے تھا۔ کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے دوبے بابو؟ دوبے یکا یک خیالوں کی دنیا سے زمین پر آگیا۔ جی کیا کہا آپ نے؟ میں نے کہا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟ نہیں ہوئی ہے پر ہو رہی ہے جلد ہی۔ آپ کو زیوروں کا شوق نہیں ہے؟ جی نہیں ہے۔ ہاں آپ کو زیور کا شوق کاہے کو ہوگا، یہ تو عورتوں کی چیز ہے۔ عورت کسی چیز سے خوش نہیں ہوتی، بس اسے زیور چاہئے۔ دوبے اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سونا رام نے پھر کہنا شروع کیا۔ میرے یہاں دوکانداری میں کھوٹے نہیں۔ ہر دوکان میں اصلی سونا ملنا محال ہے۔ دوبے کو سونا رام کی یہ باتیں غیر ضروری معلوم ہوئیں۔ ''کہئے تو دِکھاؤں دو چار نایاب چیزیں''۔ دوبے اخلاق کا مارا تھا۔ اسے دل شکنی سے پریشانی ہوتی تھی۔ دوبے نے جواب دیا ''دیکھوں کیا ہے آپ کے پاس؟'' سونا رام کے چہرے پر مسرت ناچ گئی۔ یکا یک وہ بہت حیثیت کا نظر آنے لگا۔ اس نے کئی ڈبوں پر ہاتھ ڈالا۔ کتنے ڈبوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا جیسے اس

کے ہاتھ مشاق کاروباری کے ہاتھ نہ ہوں۔ ناتجربہ کار، نومشق اور نئے کاروباری کے ہوں۔ جو چیزیں رکھ کر بھول جاتا ہے کہ کون سی جگہ کی رکھی گئی تھیں۔

سونارام نے دوبے سے کہا، دیکھئے یہ انگوٹھی ہے۔ اس نے بڑے سلیقے سے ڈبے کو کھولا اور اُف کہہ کر جھٹ بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے چمک سی پیدا ہوئی، پھر غائب ہوگئی اور اب سونارام کسی دوسرے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ دوبے نے سونارام کی ساری کیفیت دیکھ لی تھی۔ اس کے دماغ میں فوراً یہ بات پیدا ہوئی کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جسے سونارام چھپانا چاہتا ہے۔ ڈبہ کھولتے ہی اس نے بند کیوں کر دیا۔ اس کے منہ سے 'اُف' کیوں نکلا۔ اور دوبے اپنے دل پر قابو نہ پا سکا۔ مجھے اسی ڈبے کا زیور دکھایئے جسے کھول کر آپ نے فوراً بند کر دیا۔ سونارام کو جیسے چپ لگ گئی۔ پھر وہ سنبھلا اور گڑگڑا کر کہنے لگا، دوبے بابو اسے آپ نہ دیکھئے، اسے آپ نہ لیجئے۔ دوبے کا تجسس اور بڑھ گیا۔ اس نے کہا اب آپ بتا ہی دیجئے کہ ڈبے میں کیا ہے اور اس طرح آپ اس کو مجھ سے کیوں چھپا رہے ہیں۔ سونارام یکا یک ضعیف سا ہوگیا۔ اس کا لرزتا ہاتھ ڈبے کی طرف بڑھا۔ ڈبے کو کھول کر وہ کچھ دیر دیکھتا رہا، بڑی حیرت کی نگاہ سے۔ پھر انتہائی گلوگیر آواز میں بولا ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آپ کی طرح جوان اور شوقین تھا''۔ دوبے نے دیکھا کہ ڈبے میں سونے کی بندیا ہے۔ اور سونارام کی آنکھوں میں آنسو ہے۔ اور بندیا میں چند خوبصورت سے بال لپٹے ہوئے ہیں۔ سونارام نے آگے کہا، ''تو ان دنوں میرے خون میں بھی گرمی تھی اور بدن میں چستی تھی''۔ اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا اور کھو سا گیا۔ دوبے نے کہا آگے کیا ہوا۔ تو مجھے ان دنوں پہاڑی علاقوں کی سیر کا بڑا شوق تھا۔ میں ایک روز ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں صرف ایک بنگلہ تھا۔ جیسے صحرا میں پژمردہ پھول۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا''۔ آنسو کے قطرات اس کے دھنسے ہوئے پژمردہ سے گال پر ڈھلک آئے۔ ''کیا بنگلے میں کوئی نہیں تھا؟'' دوبے نے حیرت سے پوچھا۔ ''کوئی نہیں تھا سوائے ایک دربان کے جو اس وقت بنگلے کا مختارِ کل تھا''۔ دوبے نے دریافت کرنا چاہا کہ آخر وہ دربان اس مقام پر تنہا کیسے رہتا تھا۔ لیکن وہ پوچھ نہ سکا۔ سونارام کہہ رہا تھا ''مجھے وہاں رات گذارنی پڑی۔ دربان نے بتایا کہ بنگلہ رات گذارنے کے لئے کچھ مناسب نہیں۔ وہاں دیویوں کا گذر ہوتا ہے''۔ دوبے بابو میں جوانی کے ترنگ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا۔ ''تو میں بنگلے کے کشادہ کمرے میں تنہا سو گیا۔ مجھے جلد ہی نیند آ گئی۔ میرے خواب میں ایک حسین و جمیل لڑکی آئی جس کے حسن کی تعریف میں نہیں کر سکتا، اس لئے کہ میرے پاس الفاظ نہیں

ہیں۔ میں اس کی سنہری زلفوں سے کھیل رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک طلائی زیورات سے لیس تھی۔ یکا یک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے ہیں اور اس احساس کے ساتھ ہی میری پیشانی پر آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا۔ اس وقت میں اس کی بندیا سے کھیل رہا تھا۔ آنسو گرتے ہی میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے دیکھا کہ میرا خواب ایک پراسرار حقیقت ہے۔ میں نے اسے پکڑ لینا چاہا لیکن چند بالوں کے ساتھ صرف بندیا ہی میرے ہاتھ آئی۔ دوبے بابو اس حسین لڑکی نے مجھ سے پراسرار محبت کی ہے۔ یہ بندیا میرے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے''۔

دوبے گم سم تھا۔ جیسے مسحور ہو گیا ہو۔ اسے بندیا میں ایک عجیب سی کشش نظر آئی۔ سنہری زلفوں سے لپٹی ہوئی بندیا اس کا خواب بن گئی۔ اس نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا ''سونا رام بابو..... اچھا یہ تحفہ مجھے دے دیجئے۔ اس کی جو قیمت آپ مانگئے میں دے دوں گا''۔ لیکن سونا رام پر جیسے اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ دوبے مچل سا گیا۔ ضد اس کی طبیعت ثانی تھی۔ سونا رام کچھ پگھلتا نظر آیا اور آخرش دوبے نے میدان مار لیا۔ صرف پانچ سو کی رقم ادا کر کے اس کی جیب میں اس صدی کا سب سے بڑا عجوبہ ہاتھ آ گیا تھا۔ فردوس سے اسے کوئی قیمتی نشانی لے کر لوٹنا تھا، وہ اسے مل گئی تھی۔

خوشیوں کا اتھاہ سمندر اس کے دل میں مدوجزر کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اس نے سونا رام کو دوکان بند کر دینے پر مجبور کر دیا۔ سونا رام زیور دے کر کچھ اداس بھی تھا اور اب دونوں فردوس ساتھ ہی لوٹ رہے تھے۔ دوبے کو ہر قدم پر یہ احساس ہو رہا تھا کہ سونا رام کی نشانی لے کر اس نے اسے بہت دکھ دیا ہے اور وہ ہر طرح اپنی گفتگو سے اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سونا رام کے ہونٹوں سے ہنسی روٹھ گئی تھی۔

سونا رام اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ دوبے بھی اپنے دروازے پر آ گیا۔ اسے خیال ہوا کہ سونا رام چاہتے تھے کہ میں انگوٹھی خرید لوں۔ انہیں پکار کر کہہ دوں کہ وہ سویرے ہی کل آئیں۔ وہ سونا رام کے دروازے پر آ گیا۔ سونا رام اپنی سنہری زلفوں والی لڑکی سے کہہ رہا تھا— ''بیٹی اپنی سنہری زلفوں کے دو تیر اور دینا۔ آج تو ان زلفوں نے ایک کو گھائل کر دیا۔ صرف چار بال دینا کسی دوسرے زیور میں انہیں لپیٹ دوں گا''۔ دوبے کے کان سے یہ آواز ٹکرائی۔ یکا یک اس نے محسوس کیا کہ اس کی جیب میں سونے کی بندیا نہیں، کوڑھ کا مرض ہے۔

☆☆ (مطبوعہ: ماہنامہ ''صنم'' جولائی ۱۹۵۸ء)

دامنِ مریم

ہمارے ساتھیوں میں انقلابی ذہن رکھنے والے مسٹر شہباز ہی تھے۔ عجب خیالات تھے ان کے۔ زندگی کی کتنی مانی ہوئی حقیقتیں ان کے آگے محض بیکار باتیں تھیں۔ اپنے پرکھوں کی اکثر روش پر کڑی تنقید کرتے تھے۔ روایت سے بغاوت ان کا فطری شعار تھا۔ اپنی طبیعت کی اسی غیر معمولی افتاد کا وہ اپنے عمل سے بھی ہمیشہ مظاہرہ کرتے اور پھر میرے جیسے ساتھیوں کے روایتی چلن کا بہت بے تکلف انداز میں مذاق اڑاتے تھے۔ مسٹر شہباز کے بہت سے نئے خیالوں میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ شادی ایک حادثہ ہے، یہ انسان کے لئے ضروری نہیں، بقائے نسل کی خاطر ہم عورتوں سے رشتہ تو رکھ سکتے ہیں لیکن کسی ایک کے ساتھ ساری زندگی گذارنا ایک عظیم غلطی ہے۔ زندگی کی بنیادی ضرورت آزادی ہے۔ شادی اس فطری اور بنیادی آزادی کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ افلاطونی محبت ذہن کا فتور ہے اور عامیانہ جذبے کی گندی قے ہے۔ اس لئے مسٹر شہباز ہر جائی محبت کے قائل تھے۔ وہ اسے وقتی کھیل سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ اس بات پر اٹل تھے کہ دنیا کا کوئی مرد یا عورت پاک باز نہیں۔ عصمت وعفت بے معنی الفاظ ہیں، اس لئے مسٹر شہباز فرائڈ کے خیالات کو اوریجنل قرار دیتے تھے، انہیں برنارڈ شا پسند تھا۔ مسٹر شہباز کو ''آرمس اینڈ دی مین'' ازبر تھا۔ اسی پس منظر میں وہ ہر مرد کو سرجیس اور ہر عورت کو ریتا مانتے تھے۔ وہ بے تکلف محفلوں میں شیکسپیئر کی کڑی تنقید کرتے تھے۔ وہ اپنے دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ڈسڈی مونا، مرانڈا یا پورشیا جیسی عورتیں دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہوئیں، شیکسپیئر کی جنسی بھوک نے انھیں تقدس دے دیا ہے۔ ورنہ دنیا کی ساری عورتیں اپنی اصل سے ہر جائی ہیں، اور یہی حال مردوں کا بھی ہے۔ اور واقعی اس بھری دنیا کے سارے لوگ ایسے ہوں نہ ہوں مسٹر شہباز تو اپنے کردار سے کچھ ایسے ہی تھے۔ شراب وکباب کی بے تکلف محفلیں آراستہ کرتے، پھر ان محفلوں کا ذکر لطف لے لے کر اپنے ساتھیوں سے کرتے۔ وہ ساتھیوں کے بیچ شکاری کہلاتے تھے۔ انہیں عورتیں حاصل کرنے کا پورا آرٹ معلوم تھا۔ وہ اپنے وقت کے راجہ اندر تھے

اور ہر شب بڑے اہتمام سے اپنی سجا سجاتے تھے۔

دراصل مسٹر شہباز قدرت کی طرف سے ایک حساس دل لے کر پیدا ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، پُر وقار وجاہت ان کے حصے میں ضرور آئی تھی۔ کھلتا اور ہنستا ہوا چہرہ، پگھلے ہوئے سونے کے رنگ کے باعث انتہائی پرکشش تھا۔ فراخ پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں اور دبیز پپوٹے متناسب اور صحت مند جسم کی انفرادیت کو بہت نمایاں کر دیتے تھے۔ ایسی وجیہہ شخصیت کو قدرت نے بے تحاشہ بولنے والی ایک زبان بھی دے رکھی تھی۔ وہ اپنی باتوں کو موثر طریقہ پر بیان کرنے کا گر جانتے تھے۔ آواز میں ایک خاص قسم کی شیرینی اور حلاوت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسٹر شہباز جہاں کہیں بھی ہوتے بے حد نمایاں ہوتے تھے۔ ہم میں ان کے نئے اور باغی خیالات کے رد کرنے کی طاقت نہ تھی۔ ان کے اندر ایک بے مثال مقرر کی صلاحیت پوشیدہ تھی۔ اس صلاحیت کا وہ خوب خوب فائدہ اٹھاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے آگے ہم سبھوں کی کورد بتی تھی، ہم اختلاف بھی کرتے تو خاموشی سے اس لئے کہ بحث میں اُلجھنے کی سکت کہاں تھی۔ ایسے قدرتی اوصاف سے متصف ہونے کے علاوہ مسٹر شہباز ایک امیر آدمی بھی تھے۔ امارت انہیں ورثے میں ملی تھی۔ پھر وہ پیسوں کو ہاتھ کا میل تصور کرتے تھے، اس لئے یار باشی میں کثیر رقم صرف کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند قرار واقعی مخلص دوستوں کے علاوہ ان کے حاشیہ برداروں اور خوشہ چینوں کی ایک پوری جماعت ان کے آگے پیچھے لگی رہتی تھی۔ جو انہیں انجمن ساز کہتی تھی۔

پھر ہوا یوں کہ مسٹر شہباز کی امی نے اپنی پسند سے ان کے لئے ایک لڑکی منتخب کر لی تھی۔ اور اس بات پر وہ مصر بھی تھیں کہ وہ جلد سے جلد اپنا گھر بسالیں۔ مسٹر شہباز کی آزاد طبیعت ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی پابندی قبول کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے کچھ دنوں تک ٹال مٹول کی کیفیت رہی تھی لیکن ماں کا اصرار روز بروز شدید سے شدید تر ہونے لگا تھا۔ اور آخر کار ایک دن مسٹر شہباز نے بے بس ہو کر سپر ڈال دی تھی۔ وہ شادی کے لئے آمادہ تو ہو گئے تھے لیکن عورت کے متعلق اپنے باغی خیالات نہیں بدل سکے تھے۔ انہوں نے نجی صحبتوں میں یہ کہنا شروع کیا تھا کہ شادی ایک لعنت ہے، ماں کی ضد کے باعث انہیں یہ لعنت سہن کرنی پڑ رہی ہے۔ مسٹر شہباز کنوارے ہوتے ہوئے بھی کافی تجربہ کار تھے۔ اس لئے بھی شادی ان کے لئے کوئی مسرور کن چیز نہیں تھی۔

بہر حال شادی ایک حادثے کی طرح انجام کو پہنچ رہی تھی۔ مسٹر شہباز اس موقع پر نہ خوش تھے نہ غمگین۔ ان کا ذہن اسے کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ آج ہی یہ تقریب منعقد ہو رہی

تھی۔لیکن یار باشی کے اوقات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ان کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ عقد اور متعلقہ رسوم کی ادائیگی کے بعد انہیں حجلہ عروسی میں جانا تھا۔انہوں نے اپنی منکوحہ کو پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔پہلی ملاقات کے تصور سے ایک لمحہ کے لئے ان کے جسم میں جھرجھری سی آئی تھی لیکن فوراً انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا۔انہوں نے اپنے دل میں سوچا تو بہ ہے فقط ایک عورت ہی تو ہے۔اور اسی جذبہ کے تحت وہ اپنی دلہن سے قریب ہوگئے تھے۔پھر انہوں نے بڑے میکانکی انداز میں اپنی دلہن کا گھونگھٹ الٹ دیا تھا۔اس عمل کے بعد ہی انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے اردگرد روشنی پھیل گئی ہے۔مسرت غیر معمولی حسن و جمال کی عورت تھیں،اس وقت ان کی بند آنکھیں اور چمکتی ہوئی پیشانی پر پسینہ کے چند قطرے حسن کی ایک ایسی فضا قائم کررہے تھے جس سے مسٹر شہباز پہلے مانوس نہیں تھے۔آفتابی چہرے کا صندلی رنگ پھر اس پر حیا کے موتی انہیں بھائے بغیر نہ رہ سکا تھا لیکن انہوں نے اپنے جذبات سے بالکل معلق ہوکر ایک مقرر کے انداز میں کہا تھا:

> ''تم خوب صورت ہو، بے حد خوبصورت ہو لیکن عورتیں یا خوبصورت عورتیں مریم نہیں ہوا کرتیں، لیکن اس پہلی ملاقات میں تمہیں کیا دوں، کونسا تحفہ دوں، یہ ایک پھول رکھ لو۔میں اس کا حشر دیکھوں گا''۔

یہ بے ربط مگر اہم جملے مسرت کو کیسے لگے تھے معلوم نہیں لیکن اُس نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں، جن سے آنسو ٹپک پڑے تھے، پھر مسرت نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا اور مسٹر شہباز کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔اور اپنی ایک انگوٹھی مسٹر شہباز کی انگلی میں پہناتے ہوئے بولی تھی:

> ''ایک حقیر نذرانۂ محبت ہے اور مجھے تو آپ پر شک کرنے کا کوئی حق نہیں''۔

کچھ اسی مشینی انداز میں یہ شب عروسی تمام ہوئی تھی۔مسز مسرت شہباز ایک غیر معمولی ذہن و دماغ کی عورت تھیں۔لیکن ان کی پرورش و پرداخت مشرقی طریقۂ کار پر ہوئی تھی۔شرعی احکام کا انہیں پاس تھا، اس لئے ان کی روش انتہائی محتاط تھی۔انہوں نے اپنے شوہر کی ترنگ تو بخوبی محسوس کرلی تھی لیکن کسی طور بھی وہ چونچال نہیں بن سکتی۔یہ طرز رہائش اپنی جگہ بے حد دل کش تھی، لیکن مسٹر شہباز کا ترقی پسند ذہن خوبصورتی کے علاوہ بہت کچھ چاہتا تھا۔یہ بے پناہ حسن انہیں زیادہ دیر تک تسکین نہیں دے سکتا تھا۔وہ یکسانیت سے بہت جلد گھبرا گئے تھے اور یار باشی کی

پرانی روش اپنانے پر مجبور تھے۔

اور واقعی ہوا بھی یہی تھا۔ اپنی شادی کے صرف دس دن بعد جب وہ کلب پہنچے تھے تو پشیمانی کا خاص احساس انہیں اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا جیسے وہ دس دنوں تک اپنے گھر گناہ کرتے رہے تھے۔ قریبی دوستوں کی جملہ بازیاں انہیں مجروح کئے بغیر نہیں رہی تھیں لہٰذا وہ کلب کے تمام مرحلے میں شریک رہے تھے، رات گئے تک پوکر کھیلتے رہے تھے اور اسی دوران شمپئین کے کتنے ہی پیگ سے اپنا غم غلط کرتے رہے تھے۔ اور اب پو پھوٹنے والی تھی کہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدم کو سنبھالتے گھر واپس آئے تھے۔ نشہ کے عالم میں بھی اُنہوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کی مسز ان کے انتظار میں تھیں، لیکن انہوں نے ان سے کچھ پوچھا نہ تھا۔ وہ جیسے تھے اسی انداز میں اپنے پلنگ پر دراز ہو گئے تھے۔

پھر یہ صورت حال عمومی بن گئی تھی۔ ان ہی دنوں مس مارتھا کلب کی نئی ممبر بنی تھی، رمی بہت اچھا کھیلتی تھی، اس کے چلنے کا ایک خاص انداز تھا، ٹوئیسٹ میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ لچکتی اور لچک کر کھڑی ہو جاتی تو بہ یک وقت دو عالم روشن ہو جاتے تھے۔ بہت جلد مس مارتھا کلب کی روح بن گئی تھی اور مسٹر شہباز سے اُس کا یارانہ روز بروز گہرا ہوتا جاتا تھا۔ اب وہ مسٹر شہباز کے ساتھ ان کے گھر بھی آجاتی تھی، ان کی بیوی کی غیر مہذب اور پرانی زندگی پر تنقید بھی کر دیتی تھی، اسے طنزیہ انداز میں ماڈرن بننے کی ترغیب بھی دیتی تھی، مسز مسرت پر اس کے تیکھے جملوں کا کیا اثر ہوتا تھا معلوم نہیں لیکن مسٹر شہباز ایسے موقعوں پر ایک زوردار قہقہہ لگاتے تھے اور انگریزی میں چند جملے کہا کرتے تھے، جس کا مفہوم کچھ ایسا ہی ہوتا تھا ''گنوار ہے، بہت گنوار ہے، ہٹاؤ، گولی مارو۔''

ادھر نئی بات یہ ہوئی تھی کہ کلب کے چند ممبر اب مسٹر شہباز کے گھر آنے لگے تھے۔ شراب و کباب کی بے تکلف محفلیں یہاں بھی جمنے لگی تھیں، رقص و سرود کی بزم ڈرائنگ روم ہی میں آراستہ ہوتی تھی، مسز مسرت شہباز کا یہی کام رہ گیا تھا کہ وہ ڈرائی فروٹس فرائی کریں، انڈے تلیں اور کباب بنایا کریں۔ تقریباً آدھی رات تک یہ مرحلہ رہتا تھا پھر لوگ منتشر ہو جاتے تھے اور مس مارتھا مسٹر شہباز کے ساتھ کسی کمرے میں بند ہو جایا کرتی تھیں ایسے ہی مرحلے میں ایک دن مسز مسرت کی دی ہوئی انگوٹھی مسٹر شہباز کی انگلی سے نکل کر مس مارتھا کی انگلی میں منتقل ہو گئی تھی۔

اسی عالم میں ایک سال گزر گیا تھا۔ مسز مسرت بہت مرجھا گئی تھیں، کب کیا کھاتی تھیں،

پتہ نہیں، ادھر ان کی صحت برابر گر رہی تھی، بخار بھی رہتا تھا، لیکن شب بیداری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اس لئے کہ انہیں راتوں کو اپنے گھر میں پینے والوں اور ناچنے والوں کے لئے چاٹ تیار کرنا ہی پڑتی تھی، ہلکی کھانسی شروع ہو چکی تھی، لیکن جیسے انہیں اپنی صحت کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ جسمانی حسن تیزی سے مائل بہ انحطاط تھا۔ اب ان کا چہرہ زیادہ پیلا ہو گیا تھا، آنکھیں حلقوں میں گم ہوتی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی انھیں اپنے بلغم اور تھوک کو کھرچتے بھی دیکھا گیا تھا جیسے کسی جانچ میں مصروف ہوں۔ اور ایک رات جب وہ نشے کے عالم میں ڈگمگاتے اور مس مارتھا کی کمر میں ہاتھ ڈالے کمرے میں بند ہو رہے تھے تو مسز مسرت کی کھانسی تیز ہو گئی تھی پھر خون کا جیسے سوتا پھوٹ پڑا تھا۔ جانے کتنی رات تک خون کی قے ہوتی رہی تھی اور سامنے کے کمرے سے قہقہے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ صبح ہونے تک مسز مسرت ذی فراش ہو گئی تھیں لیکن مسٹر شہباز نے ان کی علالت کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور گھر سے غائب ہو گئے تھے۔

شام کے وقت پھر محفل سجی تھی۔ بہت سے احباب آ گئے تھے، مس مارتھا بھی تھی، ادھر مسز مسرت کی سانسیں بہت تیز ہو گئی تھیں، بخار کافی بڑھ گیا تھا، کھانسی کا شدید دورہ تھا۔ انہیں معاً احساس ہوا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک نہیں جی سکتیں، چنانچہ انہوں نے کسی طرح ڈرائنگ روم سے اپنے شوہر کو بلوایا تھا۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی رومال اپنی ناک پر رکھ لیا تھا۔ پھر وہ بڑی احتیاط سے اپنی بیگم کے قریب آئے تھے۔ مسز مسرت نے انہیں ایک نظر دیکھا تھا، پھر اپنی آخری ہچکیوں کے درمیان مشکل سے کچھ بولی تھیں کہ میری مٹھی میں شب عروسی کا تحفہ آپ کا دیا ہوا پھول ہے۔ اسے میری قبر کے ایک گوشے میں رکھنا نہ بھولئے گا۔

(مطبوعہ: ماہنامہ "سریر" گیا، سالنامہ، ستمبر — اکتوبر ۱۹۶۷ء)

آئینہ سے شکوہ مت کیجئے

ظلِ رسول کو اپنی موت سے سخت حیرانی ہوئی، انہیں شدت سے اس کا احساس ہوا کہ ان کی موت بے وقت ہوئی ہے، چالیس کا سن کچھ ایسی عمر نہیں کہ آدمی مر جائے، پھر اس وقت جب انہیں اپنی صحت بحال رکھنے کی ہمیشہ کد رہی ہو، اپنی مذہبی افتادِ طبع کے باعث قضا وقدر کے معاملات میں انہیں دخیل نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن انہیں اس کا خیال تھا کہ اللہ کی راہ ناہموار نہیں، اس کے ہر فیصلے میں ایک منطقی ربط ہوتا ہے، ایسے میں ان کی اچانک کی موت کی کیا تاویل ہو سکتی تھی۔' اور ان کا ذہن کوئی تاویل کرنے سے قاصر تھا، خصوصاً اس وقت جب نیک کاموں کی تکمیل کی ایک پوری فہرست ان کی نگاہوں کے سامنے تھی وہ یتیم خانہ جو ابھی ان کی شب و روز کی محنت سے قائم ہوا تھا ٹھیک طور سے جم نہ سکا تھا، دینی مدرسہ کے قیام کو پانچ سال ہو چکے تھے لیکن اس کی اقتصادی حالت ہنوز استوار نہیں ہوئی تھی سیکولر نظام میں مسلمانوں کے عقیدے کی درستگی کا مسئلہ ان کے ذہن و دماغ کو کچوکے لگا رہا تھا اور اس ضمن میں کوئی ٹھوس قدم اٹھانا ابھی باقی ہی تھا، پوری ملت کو ایک دھاگے میں پرونے کا عزم بس خواب ہی رہا، اس کے لئے وقت چاہئے تھا اور وہ وقت انہیں کہاں ملا۔ یہ سب کچھ اور بہت کچھ کرنا تھا کہ موت کی آغوش وا ہو گئی اور ظلّے کے قدم بادل ناخواستہ اس کی طرف بڑھ گئے۔ ادھورے کاموں کے علاوہ چند دوسری باتیں بھی انہیں پریشان کر رہی تھیں، انہوں نے سوچا اس بوڑھے نوکر کا کیا ہوگا جس کی روزی ان کی زندگی سے وابستہ تھی۔، اس دوست کا کیا حشر ہوگا جو تمام سماجی اور دینی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتا رہا،۔ اور۔ اور نگار ینہ کا کیا عالم ہوا ہوگا، نگار ینہ جو کسی اور کی نہ تھی، صرف ان کی تھی، ایک عرصہ سے مقدس رشتہ میں بندھ جانے کے انتظار میں تھی۔ اس کی موٹی موٹی سوئی سوئی سی آنکھیں اس وقت اشکبار ہوں گی، لال بھبھوکا چہرہ غم کی لہروں سے اور بھی سرخ ہو گیا ہوگا، اس کی بکھری ہوئی لمبی زلفیں سوگوار حسن کا کیسا المناک منظر پیش کر رہی ہوں گی۔ نگار ینہ کو کیا معلوم نہیں کہ ظلّے کی بس یہی خواہش رہی تھی کہ کچھ ضروری قومی کام انجام پا جائیں تو پھر۔ تو پھر شادی، لیکن اسے کیا

معلوم تھا کہ موت کا ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے، بڑھ چکا ہے،۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے شادی نہیں کی ورنہ آج نگار ینہ بیوہ کہلاتی۔ لیکن اب کیا وہ ایک بیوہ سے کم ہے،۔ نہیں وہ تو محض کنواری ہے،۔ لیکن کیا وہ کسی سے شادی کر سکے گی۔ نہیں ہرگز نہیں، نگار ینہ تو ایک ضدّی ہے،۔ تو پھر اس کی زندگی کیسے کٹے گی،۔ لیکن وہ جائداد جو اس نے نگار ینہ کے نام لکھ دی تھی اس کی زندگی بھر کے لئے کافی ہے،۔ پھر بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے، ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئے، نگار ینہ شادی کر لے، اسے کرنا چاہئے، کیا غمخوار دوست اتنا سا کام اس کی طرف سے نہیں کر سکے گا، کیا وہ نگار ینہ کو کسی مناسب آدمی سے نباہ نہ دے گا، لیکن نگار ینہ بھی تو ایک ضدّی ہے، تو کیا ہوگا؟ تو کیا ہوگا؟۔ معاظلِ رسول کی روح تڑپ گئی اور اسے ایک نظر دیکھ لینے کے لئے بیتاب ہوگئی!

ظلّے کی روح نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ اپنے بوڑھے نوکر کے پاس جائے گی، پھر دوست کے ہاں، پھر نگار ینہ کے نزدیک۔

لیکن وہ بوڑھا نوکر کہاں گیا ہے۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں کیوں نہیں ہے؟۔ کیا غم کی لہریں اسے کہیں بہا لے گئیں۔ تو وہ غمخوار دوست۔ اف اس کی ناگفتہ حالت دیکھی کیسے جا سکے گی۔ وہ بھی موجود نہیں، گھر پر موجود نہیں، کیا وہ غم کی گپھاؤں میں گم ہوگیا۔ تو نگار ینہ۔ اس کے دروازہ پر وہ بوڑھا نوکر، لیکن اس کے چہرے پر بشاشت کیا معنی،۔ اور اس کے ہاتھوں میں اتنے سارے روپئے۔ اور وہ کہہ رہا ہے۔ کیا اس نے وہی سنا جو اس نے کہا۔ ''جلئے بابو کو جہر دینے کے لئے پان سو روپیہ کہا تھا اور دیا تین سو، مجفّر بابو پکا بیمان ہے۔''

اف تو کیا اس کے اپنے یار غار نے زہر دلوایا ہے، مظفر اس کا اپنا دوست، غمخوار، توبہ۔ تو نگار ینہ کو فوراً اطلاع ملنی چاہئے کہ مظفر قاتل ہے، اس کے ہتھکنڈوں سے اسے بچنا چاہئے وہ آستین کا سانپ ہے، لیکن وہ بوڑھا نوکر بھی۔ تو آدمی کس پر اعتبار کرے۔

لیکن نگار ینہ اپنے کمرے میں کیا کر رہی ہے۔؟ قد آدم شیشہ کے سامنے، اس نے آج نیا جوڑا پہنا ہے، اپنی پلکیں سنواری ہیں، غازہ لگایا ہے، مہندی رچائی ہے۔ یہ سب کیوں۔ یہ سب کیوں؟ کیا وہ مرے ہوئے آدمی کی دلہن بن رہی ہے، سج رہی ہے، باؤلی بنی ہے کیا۔ اور یہ آواز۔

''تو آجاؤں، ہو چکا انتظار مجھ سے، ایک گھنٹہ سے انتظار کر رہا ہوں، آخر صبر کی انتہا ہوتی ہے''۔ تو دوسرے کمرے میں مظفر ہے۔

اور پھر جواب، نگار ینہ کے لب ہلے ہیں آئینہ کے سامنے، قد آئینہ کے سامنے۔

''آجایئے، آجایئے، آجایئے، اب آ بھی جایئے''

اف تو نگارینہ یہ ہے جو وہ دیکھ رہا ہے، اور وہ نگارینہ کیا اس کے ساتھ فنا ہوگئی۔

وہ پھر بول رہی ہے مظفر کی آغوش میں مچل کر:

''بوڑھا ظلّے ایکدم احمق تھا، پرلے درجے کا الّو کا پٹھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا، اپنا چہرہ کبھی آئینہ میں نہیں دیکھا۔ چیچک رو، بدہیئت، کندۂ ناتراش۔ تم نے اس کانٹے کو خوب الگ کیا''۔

اور مظفر نے نگارینہ کے ہونٹ چوم لئے۔ چومتا ہے اور کہتا ہے۔ ''ظلّے مرگیا، ہمیشہ کیلئے مرگیا، اب اس کا ذکر فضول ہے، وہ پیدا اسی لئے ہوا تھا کہ ہم لوگوں کے لئے ایک بڑی دولت جمع کردے، سو وہ کرگیا، مدرسہ ہو کہ یتیم خانہ کہ اس کی جائداد کہ نگارینہ۔ اب سب میری ہے، صرف میری۔''

''تمہاری ہے تو میری بھی ہے'' نگارینہ چہکی ''بالکل تمہاری ہے، ہاں تمہاری ہے''۔ مظفر کے ہاتھ ادھر ادھر بہکتے ہیں۔

ظلّ رسول کی روح تیزی سے پلٹتی ہے اور اپنی جگہ واپس آ کر خدا کا شکر ادا کرتی ہے، ظلّ رسول سوچتا ہے کہ کیا اس کی موت وقت پر ہوئی یا اسے اور پہلے مرنا چاہئے تھا؟

(مطبوعہ: ماہنامہ ''مریخ''، پٹنہ، فروری ۱۹۶۸ء)

HaSnain Sialvi

تھرٹی روپیز — نٹ

یکا یک میری آنکھوں نے یہ محسوس کیا کہ چورنگی کی شام آج زیادہ حسین ہے، اور دنوں سے بہت زیادہ۔ ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اُف یہ صحافتی زندگی لعنت ہے۔ کمبخت اتوار کو بھی فرصت نہیں ملتی۔ یہ نقرئی آوازیں، لہراتے ہوئے دوپٹے، آغوش وا کئے ہوئے سجے سجائے ہوٹل، موسیقی اگلتے ہوئے بار — پر میرے لئے کیا ہے۔ شام ہوتے ہی خبروں سے سر کھپانا پڑتا ہے۔ لمبی لمبی تقریریں، ہندوستان کا پنج سالہ منصوبہ، تخفیف اسلحہ، آئزن ہاور پلان، مسئلہ کشمیر، ہندی بچاؤ تحریک، گئو رکشا۔ طلبا پر اشک آور گیس کا استعمال، فائرنگ، روسی اسپوٹنگ، امریکہ کا اڑن بم، نہرو کے بعد، شرنارتھیوں کو بساؤ، ہندوستان آگے بڑھ رہا ہے..... دماغ ہے کہ اخبار..... میں نے ایک بار پھر ذہن کو جھٹک دیا۔ عجیب ملازمت ہے۔ شام چھ بجے سے ایک بجے رات تک روزانہ ''اخوت'' کا دفتر ہے۔ خبروں کا پلندہ ہے اور میرا قلم ہے۔ خونِ جگر خشک کرتے جایئے۔ دو بجے رات تک بھی فرصت مل جائے تو غنیمت ہے۔ پھر نیند میں..... ٹرین الٹ گئی، پچاس افراد مجروح، پاکستان میں وزارتی بحران، ہندوستان کو امریکی قرضہ۔ بس چین نہیں ہے سوتے جاگتے۔ اخبار، خبریں۔ فرصت کہاں ہے۔ چورنگی کی شام کتنی دلکش ہے۔ کتنے ہی خوش نصیب چہل قدمی میں مصروف ہیں۔ خوش گپیاں ہو رہی ہیں۔ فضا خوشبو سے معطر ہے۔ ملی جلی خوشبو، سینٹ، عطر، شراب..... اور یہ محبوبائیں اپنے عاشقوں کے ساتھ محوِ خرام ہیں..... راز و نیاز کی باتیں..... میں نے محسوس کیا۔ میں چورنگی میں بت بنا ایک ہی جگہ کھڑا ہوں اور مجھے دفتر بھی پہنچنا ہے..... اور پھر میرا کیا حق ہے کہ حسین مناظر سے اپنی آنکھیں چپکاؤں۔ فرصت کہاں، لیکن کل وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ صحافیوں کو فرصت ہی فرصت ہے۔ ممکن ہے ہو..... اور تقریر کی دوسری بات ہندوستان ہر روز آگے بڑھ رہا ہے..... ٹھیک ہی تو کہا تھا..... دیہات سدھار کا کام تیزی سے ہو رہا ہے..... عورتیں پولس بن رہی ہیں..... اور آج بھی کچھ کہیں گے۔ رائٹرز کانفرنس ہے۔ مجھے دفتر جلد پہنچ جانا چاہئے۔ الیکٹرک ہاؤس کے نزدیک کی بس..... یہ بس اسٹاپ بھی عجیب ہے.....

اسٹاپ ہے کہ جنکشن..... مجھے جلدی دفتر پہنچنا ہے اور یہ اڑی گھوڑی بنی ہوئی ہے۔ اگر ایک کار ہوتی، کتنی ہی کاریں گذر گئیں۔ بس ہے کہ کھڑی ہے۔ آخر پسنجر لینے کی بھی حد ہے۔ ''لیڈیز سیٹ پلیز''..... میرے خیالات کا دھاگا بیچ سے ٹوٹ گیا..... آں..... سوری..... تھینکس۔

اور اَب میں بس میں کھڑا ہوں۔ لیڈیز سیٹ پلیز۔ یہ آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے دیکھا سامنے کا موٹا آدمی اس عورت کو برابر گھور رہا ہے۔ ہونہہ یہ گانٹھ کا پورا ہے..... دل کا سوم ہے جب ہی تو کار نہیں رکھتا۔ اس کی بھری موٹی توند میں کتنے ہی آئرن سیف ہیں۔ مجھے جانے کیوں اس شخص سے گھن آ رہی ہے۔ لیکن وہ اس عورت کو دیکھے ہی جا رہا ہے۔ اُلو کا پٹھا۔ ٹکٹ پلیز..... اور میں نے کہا محمد علی پارک جائیں گے۔ میں نے دیکھا کنڈکٹر بڑا ہی خوبصورت ہے۔ لیکن ''ٹکٹ پلیز'' کی آواز مترنم نہیں تھی۔ ڈھیلے ڈھول کی سی آواز۔ شاید آواز پھٹ گئی تھی۔ اسے تو مرغے کی بانگ کے ساتھ اٹھنا پڑتا ہے۔ دن بھر طرح طرح کی آوازیں نکالنی پڑتی ہیں۔ ٹکٹ سر، ٹکٹ لیجئے، نہیں ہوڑہ، نہیں ذکریا اسٹریٹ، مٹیا کالج، گرلس پارک، باند کے ایک سواری زنانہ، ٹھیک ہے چھوڑنا۔ اس کا چہرہ خشک سا ہو گیا ہے۔ بال ایک دوسرے سے چمٹ کر رسّی بن گئے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جم گئی ہے۔ ہائے یہ خوبصورت آدمی۔

اور یہ کیا..... یہ کون ہے؟ کوئی پریشان حال معلوم ہوتا ہے۔ اس کی قمیض مونڈھے سے پھٹی ہے۔ پاؤں میں باٹا کی چپل ہے جو کہیں کہیں سے ٹوٹ رہی ہے۔ ہاتھ میں دوا کی شیشی ہے۔ شاید اس غریب کا کوئی آدمی بیمار ہے، دوا کی شیشی، ممکن ہے باپ علیل ہو، ماں، بہن، بھائی، بیوی، بہر حال کوئی بیمار ضرور ہے۔ اور یہ کیا..... میری آنکھوں کو یقین نہیں ہو رہا ہے۔ پھٹی قمیض والے کے ساتھ بیٹھا جیب تراش ہے۔ اس کا ہاتھ پریشان حال شخص کی جیب میں جا رہا ہے۔ دو روپئے کا نوٹ اب اس کی انگلیوں میں ہے۔ مجھے غل کرنا چاہئے۔ لیکن..... لیکن جیب کترا تو بس سے باہر ہو گیا۔ ٹکٹ دینا، ہاں..... میرا نوٹ، میں لٹ گیا۔ میری ماں بیمار ہے، مجھے دوا لانی تھی۔ پریشان حال اپنا سر پیٹ رہا۔ کنڈکٹر مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ جانے یہ کیسی مسکراہٹ ہے۔ عوام کو غریب کی ماں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب وہ بھی بس سے باہر ہو چکا ہے۔ حسین عورت اپنا پسینہ پوچھنے لگی۔ رومال سے خوشبو کی لہر اٹھی اور بس میں رقص کر گئی۔ موٹی توند والا مسکرایا۔ عورت بے نیاز رہی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو نوجوان نے پلٹ کر عورت کی طرف دیکھا۔ ان کے بال دلیپ کٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان کے بدن پر کاغذ جیسی قمیض ہیں۔ ایک کی قمیض پر سینڈل، ٹوتھ

پیسٹ اور گھڑی وغیرہ کے اشتہار ہیں اور دوسری قمیض پر ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں۔ ان دونوں نے پھر الٹ کر دیکھا۔ ایک نے کہا ''مر گئے''، دوسرے نے کہا ''تو گھیر پھر''۔ میں نے اپنے دل میں کہا، یہ عورت کتنی حسین ہے اور کتنی بے نیاز۔ ماحول سے خود کو بے تعلق رکھے ہوئے۔ میں نے ایک بار پھر اس کا سراپا دیکھا۔ عجیب حسن ہے، متاثر کر دینے والا۔ جانے یہ کس کی محبوبہ ہے، بیوی ہے۔ نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں..... اور موٹا سیٹھ حسین عورت کو دیکھے جا رہا ہے۔ بالکل بے حیا بن کر۔ میرے سامنے بھی کچھ عورتیں بیٹھی ہیں۔ عمر بہت زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ گال پچکے سے ہیں، آنکھوں میں چمک نہیں ہے، جسم میں خوشبو نہیں ہے۔ حسن کے نشانات اب بھی ہیں لیکن بڑے دھندلے۔ کبھی حسین ہوں گی یہ عورتیں۔ اب تو ان میں کچھ نہیں ہے۔ خشک ڈال ہیں یہ۔ میرے دل میں ان عورتوں کے لئے ہمدردی کی ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ ''جاگتے رہو''، میں نے الٹ کر دیکھا۔ دو بچے آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چہرے سے بڑے بھولے بھالے ہیں۔ دونوں ہی ہاف پینٹ میں ملبوس ہیں۔ ''جاگتے رہو'' اور ''دیوداس'' ان کی زبان پر تھے۔ دلیپ کمار، راج کپور سے اچھا ہے۔ ڈیڈی کہتے تھے راج کپور دلیپ سے اچھا ہے۔ سسٹر کہہ رہی تھی..... دونوں ہی بچے اپنی پسند کی صحت میں اپنے گارجین کا حوالہ دے رہے ہیں۔ دو چار اور، بچوں کی بحث میں شامل ہو گئے۔ اسکول کے بچے، فلمی اثرات، نہرو کی تقریر، طلبا ڈسپلن سیکھیں..... اور سیٹھ حسین عورت کو دیکھے جا رہا ہے..... اور یہ حسین عورت۔ آذر کا خواب ہے، کسی شاعر کی تخیل ہے، کسی کہانی کار کی ہیروئن ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ حسین عورت سیٹھ کی نظروں کی چبھن محسوس کر رہی ہے، پریشان ہو رہی ہے۔ اس کے تابناک چہرے پر کئی طرح کے پھول کھل رہے ہیں۔ شرم و حیا کے، پریشانی کے، گھبراہٹ کے۔ سیٹھ کی گردن پکڑ لوں..... اسے دھکے دے کر بس سے باہر کر دوں..... شریف عورتوں پر ایسی نگاہ..... بچے اپنی بحث میں مشغول ہیں۔ میلی عورتیں بس سے اتر چکی ہیں۔ خوبصورت کنڈکٹر دلیپ کمار کٹ بال والوں سے الجھ رہا ہے۔ ہم لوگوں کے پاس تیرہ آنے ہیں۔ ہم دونوں کو سیکنڈ شو فیشن دیکھنا ہے۔ مار پیٹ کی نوبت ہے۔ کنڈکٹر ذرا ڈرا سا ہے۔ اس کی آواز اب دھیمی ہوتی جا رہی ہے۔ اب وہ مولوی صاحب کی طرف ٹکٹ کے لئے بڑھ رہا ہے۔ مولوی صاحب وضع قطع سے رئیس معلوم ہو رہے ہیں۔ ان کی داڑھی بڑی گھنی ہے۔ چہرہ بڑی حد تک متاثر کرتا ہے۔ ہاتھ میں پرانی وضع کی نازک سی چھڑی ہے۔ منہ میں پان ہے جس کی کچھ پیک ان کی رعب دار مونچھوں سے لپٹ گئی ہے۔ کنڈکٹر مولوی صاحب

کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مولوی صاحب کی شاید منزل آ گئی۔ بس ابھی رُکی نہیں ہے۔ مولوی صاحب اب گیٹ کے پاس آ گئے۔ کنڈکٹر سے ان کی دوری کچھ زیادہ ہوگئی۔ بس کی رفتار کچھ دھیمی ہورہی ہے۔ مولوی صاحب بس سے باہر ہو گئے۔ کنڈکٹر مسکرا رہا ہے۔ جانے یہ مسکراہٹ کیسی ہے؟ ''بچے ڈسپلن سیکھیں اور بوڑھے؟'' میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرا، بے تکا سوال۔ حسین عورت پہلو بدلنے لگی۔ سیٹھ نے بھی سیٹ سے اٹھنے کی تیاری کی۔ محمد علی پارک..... میں نے بڑی جلدی کی۔ جھٹ سے گیٹ کے پاس آیا۔ بس رُک چکی ہے اور اب میں بس سے باہر ہوں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا حسین عورت..... حسین عورت بھی شاید یہیں کہیں رہتی ہے۔ ایک سگریٹ دوکان سے لے لوں..... ریڈ اینڈ وائٹ..... ایک پاکٹ نہیں، صرف ایک..... جلتی رَستی سے اسے جلا بھی لوں۔ دیا سلائی کون رکھے..... یس ہیئر پلیز..... حسین عورت..... دیا سلائی..... لٹ یور سگریٹ..... تھینکس..... میرے پاس جگہ نہیں ہے..... یو آر ٹو میچ..... تھرٹی روپیز نٹ..... میرا سر گھوم گیا..... میرا سر گھوم رہا ہے۔ حسین عورت، سیتا، آذر کا خواب، شاعر کی تخیل، شریف عورت، تھرٹی روپیز نٹ''۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میں ویسا نہیں ہوں۔ آئی ایم ویری سوری..... یونان سنس..... حسین عورت آگے بڑھ گئی ہے۔ آگے سیٹھ ہے..... میں نے سنا، میرے پاس جگہ نہیں ہے، یو آر ٹو میچ، تھرٹی روپیز نٹ۔ ٹھیک ہے..... حسین عورت سیٹھ کے ساتھ ہے..... حسین عورت، تھرٹی روپیز نٹ، سیٹھ کا بستر..... اور آج وزیر اعظم کی تقریر ہے..... نہرو کی تقریر ہے، ہندوستان آگے بڑھ رہا ہے۔ ہمیں بھارت کی عورتوں پر ناز ہے۔ تخفیف اسلحہ، پنچ شیلا، آزادیٔ نسواں..... اُف مجھ سے کچھ لکھا نہیں جاتا۔

(مطبوعہ: ماہنامہ ''صنم''، اپریل ۱۹۵۸ء)

ریتا

ریتا کی باتیں مجھے اکثر یاد آتی ہیں اور رینو کی ایکدم نہیں۔ حالانکہ رینو مجھ سے زیادہ قریب رہتی تھی۔ پتہ نہیں میرے دل میں ریتا کے لئے کون سی جگہ رہی تھی۔ چار سال کی مدت گذر چکی ہے۔ اس عرصہ میں، میں ریتا کو نہیں بھولا ہوں۔ اس کے گہرے اور تیکھے نقوش میرے ذہن و دماغ پر کئی موقعوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ جب میری بیوی مجھے معمول سے زیادہ پیاری لگنے لگتی ہے تو مجھے ریتا یاد آتی ہے۔ میری طرف سے جب کبھی وہ بدگمان ہوتی ہے تو مجھے ریتا یاد آتی ہے۔ جب میری کوئی بہت فاش سی غلطی وہ معاف کرتی ہے، مجھے ریتا کا خیال آتا ہے۔ جب وہ ذرا سی بات پر بگڑ جاتی ہے، مجھے ریتا یاد آتی ہے۔ اور جب وہ مجھے کوئی بہت بڑا صدمہ دیتی ہے تو مجھے ریتا یاد آتی ہے۔

میں ریتا کے یہاں رینو کو پڑھاتا تھا۔ رینو بہت پیاری سی بچی تھی۔ اس وقت اس کی عمر گیارہ سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ طبیعت کی بے حد چنچل۔ پڑھنے میں بہت تیز۔ رونے میں بہت آگے۔ میں ہر شام رینو کو پڑھانے آتا تھا۔ ہر شام وہ اپنی ذہانت سے مجھے متاثر کرتی تھی اور ہر شام وہ میری معمولی سی پوچھ مات پر روتی تھی۔ پتہ نہیں رینو کی طبیعت کہاں تک ریتا سے مطابقت رکھتی تھی۔ پر ریتا کی ذہانت کا حال مجھے کبھی رینو کی زبانی معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ شاید رینو ریتا کو بہت چاہتی تھی۔ تب ہی تو وہ بار بار اپنا سبق دہرانے کے دوران ریتا کا نام لے لیتی تھی۔ ''دیدی نے یہ بتایا ہے''۔ ''دیدی میٹرک میں فورتھ آئی تھی''۔ ''دیدی کو آپ نہیں پڑھا سکتے وہ بہت ذہین ہیں، انہوں نے کبھی کوئی ٹیوٹر نہیں رکھا''۔ ''دیدی اپنے آئی.اے کے کلاس میں سب سے تیز ہیں''۔ ''دیدی آج بہت روئی ہیں۔ انہیں ہسٹری میں کم نمبر ملا ہے، سو میں ففٹی''۔ رینو کے ریمارک کی روشنی میں ریتا کی صلاحیت کا اندازہ لگا سکتا تھا اور ریتا کو دیکھنا بھی چاہتا تھا۔

رینو کو میں تین سال سے پڑھا رہا تھا۔ ریتا کی طرح یہ بھی اپنے کلاس میں اوّل آئی تھی۔ یہ سال اس کے میٹرک کا تھا اور اس سال ریتا مجھ سے قریب آئی تھی۔ ریتا بی.اے کر رہی تھی۔

اکونومکس اس کا ایک سبجیکٹ تھا۔ میں نے اس مضمون میں ایم.اے کیا تھا۔ وہ کچھ غیر متوقع طور پر اکونومکس کے چند موضوعات پر میرا لکچرر چاہتی تھی، جو میں نے قبول کر لیا تھا۔ پہلے میں نے Topics پوچھے تھے۔ پھر ان پر اچھی اچھی کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر ذہن میں لکچرز مرتب کئے تھے۔ تب میں نے ریتا کو کچھ بتایا تھا۔ ریتا لکچر کے دوران بہت سے ضمنی سوالات کرتی تھی جو بہت پریشان کن ہوتے تھے، اور میں گھبرا سا جاتا تھا.....اور ریتا مسکرا دیتی تھی۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک دن رینو بیمار تھی۔ بہت بیمار۔ میں نے رینو کا ٹمپریچر دیکھا تھا۔ پھر جلد ہی واپس ہونا چاہتا تھا۔ ریتا اسی دوران چائے لے آئی تھی۔ میں نے انکار کیا تھا۔ میں نے اس دن ریتا کا غصہ دیکھا تھا۔ اس نے پیالیاں توڑ دی تھیں اور پھر رونے لگی تھی۔ اس وقت ایک واقعہ اور یاد آرہا ہے۔ ریتا نے مجھے شیشہ کا ایک پھولدان دکھایا تھا اور بتایا کہ وہ میڈ آف زیکوسلاویکہ تھا اور اس کی قیمت بہت تھی۔ نہ جانے کس طرح ریتا کے تبصرے کے دوران ہی میرے ہاتھ سے وہ پھولدان چھوٹ کر گر گیا تھا اور گر کر چور چور ہو گیا تھا۔ میں بہت خفیف ہوا تھا۔ لیکن ریتا کا چہرہ شاید اس وقت کوئی اثر لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ بالکل اس طرح رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ مجھ پر غصہ نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی روئی تھی۔ بلکہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے غیر متوقع طور پر مجھے ہی مطمئن کرنا چاہا تھا۔ وہ بڑے پیار سے بولی تھی، ''ٹوٹ گیا تو کیا ہوا، میں تو آپ کو بنانے کے لئے اس کی تعریف کر رہی تھی''۔ لیکن رینو سے پوچھنے کے بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ پھولدان اس کی دیدی کو بہت عزیز تھا۔ اور ایک دن تو عجیب بات ہوئی، میں رینو کو پڑھا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کمرے سے لگے ہوئے دوسرے کمرہ کے پردے سے دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور پھر میرے کانوں سے ایکدم یہ آواز ٹکرائی تھی— ''رینو کے ماسٹر تو بہت کالے ہیں''۔ اور پھر ریتا کی آواز آئی تھی— ''واقعی تم ایڈیٹ ہو۔ ہمیشہ اجڈ ہی رہو گی۔ اس طرح کوئی کسی پر کمنٹ کرتا ہے۔ تم تو سرخاب ہونا''۔ میری طبیعت یہ سب کچھ سن کر مکدر ہو گئی تھی اور میں نے اس دن رینو کو کچھ نہیں پڑھایا تھا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ مجھ پر کمنٹ کرنے والی ریتا کی کوئی بہت ہی پیاری سہیلی رادھا تھی۔ رینو نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ میرے آنے کے بعد دونوں سہیلیوں میں خوب خوب جھڑپیں ہوئی تھیں۔ رادھا روٹھ کر ریتا کے گھر سے چلی گئی تھی۔ پھر وہ سال بھی گذر گیا تھا۔ رینو میٹرک میں فسٹھ آئی تھی اور ریتا بی.اے میں اکونومکس میں فیل ہو گئی تھی۔

میں نے رینو کو پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ آئی.اے میں تھی۔ مجھے برماشل میں ملازمت

مل گئی تھی۔ میں مصروف رہنے لگا تھا۔ ریتا مجھے خط لکھتی رہی تھی۔ لیکن میں اس کے خطوط کا نہ جانے کیوں نہیں جواب دیتا تھا۔ اسی دوران میری شادی کی بات بھی ایک جگہ چل رہی تھی۔ پھر میری شادی ہوگئی تھی۔ مجھے ریتا کے خطوط یاد آتے تھے اور میں ایک دن ان خطوط کے جواب میں خود اس کے یہاں اپنی بیوی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ رینو ہم سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ ریتا بھی تپاک سے ملی تھی۔ اس کے ٹھیک چھ ماہ بعد ریتا یکا یک میرے یہاں آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بہت ہی خوبصورت نوجوان تھا۔ اس نے اس نوجوان سے میرا تعارف اس طرح کرایا تھا— ''یہ میرے پتی ہیں مسٹر آئی ایس دوبے۔ شیو جی کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ اور یہ رینو کے ماسٹر، برماشل میں کلرک ہیں۔ ان کا نام وجے ہے''۔ میں اس تعارف سے کچھ بوکھلا سا گیا تھا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ریتا پھر بولی— ''مسٹر وجے ہم لوگ پھر ملیں گے۔ ہمیں پکچر جانا ہے۔ دراصل ہم راہ میں ہیں۔ لیکن ماسٹر جی آپ پہلے سے زیادہ کالے ہوگئے ہیں۔ وجہ کیا ہے آخر؟'' میں ابھی جواب ہی دینا چاہتا تھا کہ وہ چلے گئے۔ ان کی پکچر چھوٹ رہی تھی۔ اس دن کے بعد ریتا سے میری ملاقات پھر نہیں ہوئی۔ ریتا مجھے بہت یاد آتی ہے۔ نہ جانے کیوں؟

(مطبوعہ: ماہنامہ ''صنم'' جولائی ۱۹۵۹ء)

سب خیریت ہے

پہلا منظر

ریحان: یوں دروازے پہ کیوں کھڑی ہو، معاملہ کیا ہے؟

عذرا: بس یونہی

ریحان: یونہی تو نہیں، کچھ بات تو ضرور ہے۔

عذرا: آپ جان کر انجان بنتے ہیں، چار بج گئے رفّو، شفّو آئے نہیں۔

ریحان: چار بج گئے تو کیا قیامت ٹوٹ گئی، ساڑھے تین تک تو کلاس ہوتے ہیں، پھر چھ کیلومیٹر بس کی سواری۔

عذرا: لیکن پونے چار بجے بچے آجایا کرتے ہیں، اور اب.....

ریحان: لو وہ آ بھی گئے، سنبھالو انہیں۔ (سرگوشی میں: ممتا بھی کیا چیز ہے، چند منٹوں کی دیر نے ماں کے ہوش اڑا دیئے لیکن سچ تو یہ ہے میں بھی کم۔ چلو ہٹاؤ)

دوسرا منظر

ریحان: اب تو بچے اسکول جا چکے، انہیں تم بس تک چھوڑ بھی آئیں، اب کیا سوچ رہی ہو؟

عذرا: کچھ بھی نہیں تو۔

ریحان: کچھ بھی نہیں کیسے، تم وہ نہیں، تمہارا چہرہ بجھا سا ہے۔

عذرا: ہاں وہ کل ایک جیپ سے ایک بس ٹکرا گئی تھی، سنا ہے کئی آدمی مر گئے۔

ریحان: اور تم سوچ رہی ہو کہ بچے روز اسکول بس سے آتے جاتے ہیں۔

عذرا: (خاموشی)

ریحان: سنو عذرا، میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنے بچوں سے بڑا لگاؤ، بڑا پیار ہے، لیکن ہر چیز کی حد ہوتی ہے، اگر کہیں کوئی حادثہ ہو گیا تو اس سے ہمارے بچوں پر کیا اثر پڑتا ہے، پھر حادثے پر کس کا اختیار ہے۔

عذرا: اللہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟

ریحان: نہیں عذرا، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا دل مضبوط رکھو، تمہاری کمزوری بچوں کو بزدل بنا سکتی ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساڑھے تین بجے اور تمہاری آنکھیں دروازے پر ٹک گئیں، پھر اس کے بعد لمحہ لمحہ کا حساب، یہ بھی تو سوچو سواریوں کی بھیڑ سے راستے بند ہو سکتے ہیں، کوئی اور بات ہو سکتی ہے۔

عذرا: تو میں اپنے دل کو کیا کروں، مجھے تو بچوں کا روزانہ اتنی دور آنا جانا بڑا کھلتا ہے۔

ریحان: تو پھر انہیں روک دو، کیا اسکول میں پڑھانا کوئی زور زبردستی کی بات ہے (طنز سے) کیا ہندوستان جاہلوں سے خالی ہے؟

عذرا: آپ تو خواہ مخواہ لڑنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ میں نے کب کہا کہ بچے اسکول نہ جائیں، میں نے تو بس کی سواری.....

ریحان: (بات کاٹ کر) اور میرے پاس کار بھی تو نہیں ہے اور ہوتی تو اس سے بھی دیر سویر ہوتی ہی۔

عذرا: اب چھوڑیئے بھی، خواہ مخواہ کی بحث ہے۔

تیسرا منظر

ریحان: ماسٹر صاحب! میں نے عذرا کو بتایا نہیں، وہ تو دروازے پر کھڑی میاں رفو اور میاں شفو کے انتظار میں ہزاروں ہیجان سے گزر رہی تھیں اور یہ اطمینان سے کتابوں کے تھیلوں کو پرے ڈال کر گول چکر کے میدان میں گولیاں کھیل رہے تھے، وہ تو میں وہاں پہنچ گیا ورنہ شریف زادے پانچ سے پہلے گھر واپس نہ آتے اور تب تک ان کی ماں پاگل ہو چکی ہوتیں۔

ماسٹر: ڈے اسکولوں کا یہی حال ہوتا ہے، ہر لمحہ تو ان کی نگرانی ہو نہیں سکتی۔ کچھ بڑے ہوں گے تو اسکول کی بجائے سنیما گھروں میں نظر آ سکتے ہیں۔

ریحان: تو پھر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

ماسٹر: یہی کہ انہیں ابتدا ہی سے ریسیڈنشیل اسکول میں پڑھایا جائے۔

ریحان: گویا ابتدا ہی سے بچے ماں باپ سے الگ ہو جائیں۔

ماسٹر: تو اس میں نقصان کیا ہے؟ ریحان صاحب! بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے بچے وقت پر سوتے جاگتے ہیں، وقت پر کھیلتے ہیں، وقت پر پڑھتے اور وقت پر کھاتے پیتے ہیں۔

ریحان: پھر بھی ماں باپ کا پیار تو انہیں مل نہیں سکتا۔

ماسٹر: ہاں انہیں بگاڑنے والا پیار یقینی نہیں مل سکتا، لیکن کیا آپ اس سے اتفاق نہیں کرتے کہ ریسیڈنشیل اسکول کے بچوں میں خود اعتمادی زیادہ ہوتی ہے، وہ چاق چوبند بھی زیادہ ہی ہوتے ہیں، وہ اپنے فرائض سے اتنے آگاہ ہو جاتے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہتے۔

ریحان: لیکن ایسے ماحول کی تعلیم اور تربیت کے اپنے نقائص بھی تو ہیں، سب سے بڑا عیب ہے کہ وہ ماں باپ کی اٹوٹ محبت کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ غیر ماحول انہیں ہمیشہ کے لئے اپنے ہی والدین سے غیر مانوس بنا سکتا ہے۔ ماسٹر صاحب! ذرا سوچئے معصوم بچوں کو اپنے فطری ماحول سے الگ کر دینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے، بچوں کو ان کی عمر کے مطابق ان کا فطری حق ملنا ہی چاہئے۔

ماسٹر: معاف کیجئے مجھے، آپ کی باتوں سے ذرا بھی اتفاق نہیں۔ میں یہ نہیں مانتا کہ جو بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں گویا وہ اپنے والدین کے مظلوم ہیں۔ یا یہ کہ دوری کے باعث ان میں ماں باپ کے لئے محبت میں کمی آجاتی ہے، بھلا ریسیڈنشیل اسکول کے بچوں کا ماحول غیر فطری کیسے ہے؟ ہزاروں بچے جو ہمیشہ اپنے ماں باپ ہی کے ساتھ رہتے، اپنی بڑی عمر میں انہیں بھول گئے، فراموش کر ڈالا، اس کے برخلاف ایسے بچے جو، ان سے الگ رہ کے بڑھے پلے بڑے ہی سعادت مند بیٹے ثابت ہوئے، مثالیں دونوں ہی طرح کی مل سکتی ہیں، آپ کوئی کلیہ نہیں بنا سکتے۔

ریحان: ہاں ٹھیک ہے کہ کلیہ نہیں بنا سکتے لیکن آپ کو مغربی ممالک کے حالات معلوم ہیں؟ دیکھئے وہاں کیا ہو رہا ہے؟

ماسٹر: کیا ہو رہا ہے؟

ریحان: کچھ ہی دنوں پہلے شفو، رفو کی اماں نے مجھے ایک میگزین دکھایا، اس میں ایک آرٹیکل تھا، کوئی امریکہ کے بعض شہروں میں گھوما تھا، اس کے تجربات اور مشاہدات تھے۔

ماسٹر: کیا لکھا تھا اس آرٹیکل میں؟

ریحان: بس پڑھ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ باتیں تو ہزار تھیں لیکن اس وقت کے لئے یہی کافی ہے کہ مضمون نگار نے بتایا تھا کہ باپ بیٹے ایک ہی شہر میں رہتے ہیں لیکن مہینوں ملتے نہیں، گاہے ماہے فون سے خیریت پوچھ لی، کسی تقریب میں کہیں مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک آدھ برس پر

ارادے سے مل بھی لیا، اللہ اللہ خیر صلّی۔

ماسٹر: اور

ریحان: اور کیا، یہ بھی لکھا تھا کہ بوڑھے ماں باپ ناقابل برداشت ہوتے ہیں، اولڈ کیئر ہوم میں بھیج دیئے جاتے ہیں، ایک تحریک یہ بھی چل رہی ہے کہ اپاہج بوڑھوں کو، یا لاعلاج ضعیفوں کو ہلاک کر دینا چاہئے۔

ماسٹر: تو آپ نے ان باتوں سے کیا نتیجہ نکالا؟

ریحان: نتائج تو کئی ہیں، لیکن کہنے اور سمجھنے کا پہلو یہ ہے کہ جب بچّوں کو اپنی ماں کے دودھ سے الگ کر دیا جائے گا، ان کی گود میں وہ ہمکیں گے نہیں، باپ کی نگرانی اور تربیت سے بیگانہ رہیں گے، انہیں نرسیں پالیں گی، اسکول ہی ان کی دیکھ ریکھ کرے گا تو وہ والدین کو کیا جانیں، کیا سمجھیں، اب وہ جوان ہوئے تو ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے ان کے لئے سب برابر۔

ماسٹر: گویا اگر بچّے ماں کی چھاتیوں سے چمٹے رہیں گے، ان کی گود میں اچھلے کودیں گے، باپ ان کی لمحہ لمحہ دیکھ بھال کرے گا تب ہی وہ اپنی والدین کی شناخت کریں گے، ان کی محبت میں سرشار رہیں گے اور جب جوان ہوں گے تو دودھ، گود اور نگرانی کے عوض ان کے بوڑھاپے کی لاٹھی بنیں گے، بڑا اچھا سودا ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے، لیکن میں نے تو سنا تھا کہ والدین کی محبت بے غرض ہوتی ہے۔

ریحان: وہ تو ہوتی ہی ہے، اس میں رخنہ کہاں سے پڑا۔

ماسٹر: آپ کی گفتگو سے پڑ رہا ہے، لیکن بے غرض محبت کی روداد بھی سنئے۔

ریحان: کیا کوئی کہانی سنائیں گے آپ؟

ماسٹر: ہاں کہانی ہی ہے لیکن سچی ہے۔ اس کا ایک کردار میں بھی ہوں۔

ریحان: یعنی؟

ماسٹر: یعنی یہ کہ اس زمانے میں کلکتے میں آئی. اے میں پڑھ رہا تھا، سنہ ۴۷ یا ۴۹ کی بات ہے۔ میرا ایک ساتھی تھا عبدالمجید، میں تو ٹیوشن کر کے کسی طرح اپنی گاڑی آگے بڑھا رہا تھا لیکن میرا دوست مجید بڑے ٹھسّے سے رہتا، خوب روپے خرچ کرتا۔

ریحان: امیر زادہ ہوگا۔

ماسٹر: ہاں فٹ پاتھ کا امیر زادہ تھا۔

ریحان: کیا مطلب؟

ماسٹر: مطلب یہ کہ ایک دن میں نے ہی مجید سے کہا، یار پکچر دیکھی جائے، لیکن پیسے تو میرے پاس ہیں نہیں۔ مجید بولا نہیں ہیں تو کیا ہوا، آج الجبرا کا ہنی مون کرلیں گے۔

ریحان: الجبرا کا ہنی مون، یہ کیا ہوا؟

ماسٹر: تب میں بھی چکرایا تھا۔ پھر وہ رپن اسٹریٹ کے ایک موڑ پر مجھے لے آیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی فٹ پاتھ پر چائے بیچ رہے تھے۔ ایک کونے میں دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ مجید کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھے اور اپنے کاندھے پر رکھے ہوئے کپڑے سے کرسیوں کی گرد جھاڑنے لگے، جیسے وہ ہم لوگوں کے بیٹھنے کا معقول انتظام کر رہے ہوں۔

ریحان: اس کے بعد۔

ماسٹر: تب اس ادھیڑ عمر کے چائے فروش سے مجید نے میرا تعارف کروایا۔ ان سے ملئے، یہ ہیں میرے دوست افتخار، یہ بھی آئی اے ہی میں پڑھتے ہیں اور یہ ہیں میرے پاپا۔ کوئیک پاپا، ٹو کپس آف ٹی۔ فوراً دو پیالی چائے ہم لوگ جلدی میں ہیں۔

ریحان: پھر آپ پر کیا گذری۔

ماسٹر: میں تو ششدر رہ گیا۔ اس بات پر نہیں کہ مجید کے ابا فٹ پاتھ پر چائے بیچتے ہیں، بلکہ اس پر کہ کوئیک پاپا ٹو کپس آف ٹی۔ اس کے بعد مجید نے فرمائش کی کہ اسے دس روپے چاہئیں اور ابھی ابھی چاہئیں۔ اس لئے کہ الجبرا کا ہنی مون ہے اور مجید نے خود ہی یہ بھی کہا کہ پرسوں کے دس روپے فی لوسوفی کی ویڈنگ میں ختم ہو گئے۔

ریحان: ایسے الفاظ سے باپ کو الو بنانا مقصود تھا گویا۔

ماسٹر: تو اور کیا مقصد تھا۔ میں نے دیکھا کہ مجید کے ابا نے نوٹ گنے، ایک ایک کے نوٹ تھے، یقینی دس نہیں تھے ورنہ وہ بھاگ کر دوسرے چائے والے کے پاس کھسر پھسر نہ کرتے۔ پھر مٹھیوں میں دبا کر وہاں سے کچھ لائے اور اب مجید کے پاس پورے دس روپے تھے اور ہم سنیما جا سکتے تھے۔

ریحان: اور آپ گئے بھی۔

ماسٹر: ہاں میں گیا ضرور لیکن مجید کے ابا ذہن میں گھسے رہے اور ''کوئیک پاپا ٹو کپس آف ٹی'' اور ''فیلوسوفی کی ویڈنگ'' اور ''ایک روپیہ کے دس نوٹ'' اور مجید کے ابا کی دوڑ بھاگ اور

کرسیوں کی گرد جھاڑنے کا منظر۔

ریحان: تو آپ نے مجید کو سمجھایا ہوتا۔

ماسٹر: سمجھنے والا ہوتا تو یہ سب کچھ کرتا ہی کیوں۔ لیکن میں نے کچھ معاملے کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی۔

ریحان: یعنی

ماسٹر: میں چپکے سے اکیلے مجید کے ابا کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ بہت خوش ہوتے۔ ایک بار کہنے لگے تم بھی میرے لئے بیٹے ہی ہو۔ کچھ ضرورت ہو تو کہہ دیا کرو۔ ایک دن عجیب موڈ میں تھے، بولے بیٹا افتخار! مجید کا میں باپ بھی ہوں اور ماں بھی۔ پھر کہا جب مجید ساتویں جماعت میں تھا تو وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں، بالکل اچانک، اچھی بھلی تھیں، بس سر چکرایا اور معاملہ ختم ہو گیا۔ میں نے شادی نہیں کی، مجید کے لئے مجھے ہی ماں بننا تھا۔ باپ تو تھا ہی، سو دونوں ہوں..... خیر چھوڑو، یہ بسکٹ کھاؤ، دیکھو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ توبہ میں بھی کیا کیا کہہ گیا، میں نے محسوس کیا وہ کچھ شرمسار ہیں جیسے کوئی راز فاش ہو گیا ہو۔

ریحان: مجید اب کہاں ہے اور اس کے والد؟

ماسٹر: ہم دونوں نے بی۔ اے ساتھ ہی پاس کیا، مجید کے ابا چائے بیچتے رہے، میں رانچی آ گیا، بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان میں ہے۔ کراچی میں کچھ کرتا ہے۔

ریحان: مجید کے ابا سے پھر ملاقات ہوئی۔

ماسٹر: ملاقاتیں ہوئیں، تب مجید کو پاکستان گئے سات برس ہو گئے تھے، پھر دس برس ہوئے تھے۔

ریحان: یعنی آپ ان سے دوبارہ ملے۔

ماسٹر: جی ہاں..... ایک بار میں رپن اسٹریٹ سے گذر رہا تھا کہ مجید کے ابا یاد آ گئے۔ میں ان کی چائے اسٹینڈ پر گیا، لیکن انہیں پہچاننا مشکل تھا۔ بہت دبلے ہو گئے تھے، بہت کمزور، میں نے ان سے مجید کے بارے میں پوچھا۔ بولے اس کے پاکستان جانے کے تین برس تک تو کچھ نہیں معلوم ہوا، پھر ایک خط آیا کہ وہ بینک میں کچھ ہو گیا ہے۔ پھر ایک آدھ سال کے بعد ایک خط ملا تھا جس سے پتہ چلا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اس نے کار خرید لی ہے۔ چھ مہینے پہلے کی بات ہے کہ اس کے کوئی ساتھی آئے تھے کراچی سے، وہ بھی تم لوگوں کے ساتھ پڑھتے تھے، کیا

بھلا سا نام تھا ان کا، خیر یاد نہیں آتا تو وہ بتا رہے تھے کہ اسے دو بچے ہو چکے ہیں اور وہ آج کل لندن میں بیوی بچوں کے ساتھ ہے..... پھر اچانک ان کی نگاہیں سڑک پر سے گزرنے والی ایک کار کا پیچھا کرنے لگی۔ اس کے بعد وہ خود ہی بولے، بڑے عجیب لہجے میں۔ میں پاگل ہو گیا ہوں کیا، ہر گاڑی پر بیٹھا ہوا آدمی مجھے مجید معلوم ہوتا ہے، اس پر بیٹھی ہوئی عورت اس کی بیوی، اور بچے اس کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ تین سال کے بعد میں پھر کلکتے گیا، اب کے مجھے وہاں کم دنوں رہنا تھا۔ پھر بھی مجھے ایک دن ایسا محسوس ہوا کہ مجید کے ابا سے مل لینا چاہئے۔ معلوم نہیں کہ زندہ ہیں بھی کہ نہیں۔ میں ان کے چائے اسٹینڈ پر آ گیا۔ عجیب منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ سامنے فٹ پاتھ پر ایک لاش رکھی تھی، چادر سے ڈھکی ہوئی، آنے جانے والے لوگ اس پر سکے پھینک رہے تھے۔

ریحان: وہ لاش کس کی تھی؟

ماسٹر: اور کس کی تھی؟ مجید کے ابا اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

ریحان: ایسی بے سروسامانی؟

ماسٹر: جی ہاں! مجھے لوگوں نے بتایا کہ کئی دنوں سے وہ فٹ پاتھ پر پڑے کھانستے رہے تھے اور آتی جاتی ہوئی کاروں کو بڑے غور سے دیکھتے، پھر وہ اچانک ایک کار کے پیچھے مجید مجید کہتے ہوئے دوڑ پڑے اور اس طرح گرے کہ پھر اٹھے ہی نہیں، بس ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ریحان: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بڑا عبرت آموز سانحہ ہے۔

ماسٹر: میں کہتا ہوں والدین کو اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں لیکن بچوں سے توقعات رکھنی فضول ہے، مجید کی مثال دی جا سکتی ہے۔

ریحان: اور مجید کے ابا کی بھی۔

ماسٹر: اچھا تو میں چلتا ہوں، دیکھئے آپ کی بیگم آپ کے بچوں کے ساتھ کس طرح گھری ہیں، اور کیا کچھ کر رہی ہیں۔

چوتھا منظر

ریحان: بچوں کو کیا کھلایا پلایا جا رہا ہے بیگم؟

عذرا: کچھ تو نہیں، بس انڈے ابال کر دیئے ہیں۔ اولٹین پلانا چاہتی ہوں تو یہ بھاگتے

ہیں، انہیں حلوے سے بھی رغبت نہیں، آج صبح انہوں نے چوزے کے سوپ کو پھینک دیا۔ بس چاکلیٹ کھاتے رہتے ہیں، دیکھئے ان کا جسم کیسا لاغر ہو گیا ہے۔

ریحان: میں کہتا ہوں کہ گیہوں کی روٹیوں میں جو طاقت ہے، وہ حلوے میں نہیں ہے۔ موٹی غذا انسان کو تندرست رکھتی ہے، چکنے کھانوں میں بیماریاں چھپی رہتی ہیں۔

عذرا: لعنت ہے آپ کی موٹی غذا پر۔ اب بچے سوکھی چپاتیاں کھائیں گے تو ان کا دماغ سکڑ نہ جائے گا، خاک پڑھے لکھیں گے یہ۔ ہارلکس کل ہی ختم ہو چکی ہے، بچے پنیر شوق سے کھاتے ہیں اب کے بازار سے لانا نہ بھولئے گا۔ ہاں اس ہفتے کے لئے کچھ چوزوں کا بھی انتظام کر لیجئے گا۔ سائز نہ بہت بڑا ہو، نہ بہت چھوٹا۔ تھوڑے سے رس گلے خرید لیں گے، بچے کو بہت پسند ہیں، ٹافیاں ابھی ہیں۔

ریحان: رفو، شفو کی اماں، ذرا بتاؤ تو تمہیں تمہاری اماں نے کس طرح پالا ہے؟

عذرا: بڑے شان سے، لیکن ضرورت پڑی تو ڈانٹا بھی، پھٹکارا بھی۔

ریحان: نہیں نہیں ہمیرا مطلب کھانے پینے سے ہے۔

عذرا: اب میں اس عمر میں کیا یاد رکھوں کہ بچپن میں مجھے کیا کھلایا پلایا گیا، لیکن ظاہر ہے میرے والدین اتنے امیر نہ تھے۔

ریحان: تو گویا روز سوپ، حلوے، ہارلکس، اولٹین، پنیر، رس گلے تو ملتے نہیں ہوں گے؟

عذرا: تو کہنا کیا چاہتے ہیں آپ؟

ریحان: ماشاء اللہ صحت تمہاری..... میرا مطلب یہ ہے کہ صحت تمہاری، یعنی تم دبلی تو نہیں ہو؟

عذرا: ہاں میں تو دنیا جہان سے موٹی ہوں۔

ریحان: یہ یہ نہیں کہتا..... تم صحت مند ضرور ہو۔

عذرا: تو کیا بیمار رہوں، پلنگ سے لگ جاؤں، آخر آپ.....

ریحان: خدا نہ کرے، عذرا میں تو صرف یہ جتانا چاہتا ہوں کہ روکھی سوکھی غذا، چشم بد دور تمہاری صحت کے لئے مفید ثابت ہوئی اور تمہارے بچے چکنی چیزیں کھا کھا کر دبلے ہوتے جاتے ہیں۔

عذرا: انہیں روز اتنی دور بسوں سے آنا جانا پڑتا ہے، صحت تو گرے گی ہی۔

ریحان: تو کیوں نہ انہیں ریسیڈنشیل اسکول میں رکھ دیا جائے۔

عذرا: اب میں سمجھی کہ نشانہ کہاں ہے، اتنی دیر سے ماسٹر صاحب سے یہی گٹر پٹر ہو رہی تھی؟ میں یہ فضول باتیں سننے کی نہیں، صاف صاف کہتی ہوں جو

ریحان: میری بھی تو کچھ باتیں سنو، ہوسکتا ہے اتنی صاف صاف نہ ہوں۔

عذرا: کہئے۔

ریحان: ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ ہاسٹل میں زندگی گذارنے والے بچے زیادہ تیز طرار ہو جاتے ہیں، ان میں خود اعتمادی آجاتی ہے، سلیقہ آجاتا ہے، ان کے اندر کی صلاحیتیں ابھر اور نکھر جاتی ہیں، اور جو ہم لوگ یہ سوچتے ہیں کہ Parents سے دوری کی وجہ سے ان کے دل میں ماں باپ کے لئے جگہ نہیں رہتی سو وہ بھی حقیقت نہیں ہے۔

عذرا: دیکھئے ماسٹر صاحب اگر ہمارے بچوں کو پڑھانا نہیں چاہتے تو ہم اور کوئی انتظام کر لیں گے لیکن وہ اس طرح معصوم بچوں کے پیچھے نہ پڑیں۔ میں اپنے بچوں کو اپنی آنکھوں سے دور نہیں رکھ سکتی۔

ریحان: چاہے وہ بگڑ کیوں نہ جائیں؟

عذرا: آپ ہر وقت بچوں کے بگڑنے کا قصہ کیوں کھڑا کرتے ہیں۔ یہ منحوس الفاظ آپ کی زبان پر آتے ہی کیسے ہیں، کیا میں یا آپ اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کر سکتے، دوسروں کا سہارا کیوں لیا جائے؟ پھر رفو، شفو میری آنکھوں کی روشنی ہیں، بلکہ میری زندگی ہیں۔ میں انہیں کسی قیمت پر اپنی نظروں سے دور نہیں کر سکتی۔

ریحان: چلئے مانتے ہیں کہ آپ ان کی ڈھنگ سے تربیت کریں گی، تعلیم دے لیں گی، لیکن یہ نہ کہئے کہ انہیں آپ اپنی نظروں سے دور نہیں کر سکیں گی۔

عذرا: غلط کیا کہا میں نے۔

ریحان: سراسر غلط کہا ہے۔ بچوں کو پنچھی سمجھئے، جب تک انہیں اڑنے کی صلاحیت نہیں ہے، وہ آپ کے گھونسلے میں ہیں، پر نکلے، پھر آپ کی آنکھوں سے اوجھل۔

عذرا: میرے بچے جوان ہو کر بھی اپنی اماں کو، اپنے ابا کو بھول نہیں سکتے، دیکھ لیں گے آپ، آخر میں نے ان کے پل پل کا حساب رکھا ہے۔

ریحان: مجید کے ابا نے بھی ایسا ہی کچھ حساب رکھا ہوگا۔

عذرا: کون مجید؟

ریحان: آپ نہیں جانتیں، بس اتنا سمجھئے کہ کوئی ضروری نہیں کہ والدین کی محبت بیٹے، بیٹیوں کے لئے ایسی زنجیر ہو کہ وہ توڑ نہ سکیں۔

عذرا: محبت زنجیر نہیں پھول ہوتی ہے، جس کی خوشبو پھیلتی ہی رہے گی۔

ریحان: باسی پھول میں خوشبو نہیں ہوتی، ایسے پھول پھینکے بھی جا سکتے ہیں، بھلائے بھی جا سکتے ہیں۔

عذرا: اب آپ سے کون بحث کرے!

ریحان: بحث کی بات نہیں ہے، مجھے تمہاری بے پناہ محبت سے ڈر لگتا ہے، معلوم نہیں آگے کیا ہو؟

عذرا: اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک رہے گا، اچھا تو میں چلی، دیکھیں بچے باورچی خانے میں کیا کر رہے ہیں؟

پانچواں منظر

رفو: ممی میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا تو مجھے کئی باتوں کے بارے میں سخت حیرت ہوئی۔

عذرا: کیسی حیرت!

رفو: یہی کہ ہماری ہندوستانی تہذیب خاصی پرانی ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم علوم وفنون نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔

عذرا: تمہارا مطالعہ غلط نہیں ہے۔

رفو: جی ہاں ممی، جیسے جیسے پرانے حالات کا علم ہوتا جاتا ہے مجھے ہندوستان کی عظمت کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

عذرا: ہونا بھی چاہئے بیٹے، نئی نسل کے لوگ اگر اپنے وطن کی تہذیب، یہاں کے تمدن، یہاں کے کلچر سے بے نیاز ہو جائیں تو پھر مستقبل کے وطن پرست اور رہنما کون ہوں گے۔

رفو: ممی تہذیب اور تمدن بدلنے والی قدریں ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کو مہذب بنانے میں کس کا رول سب سے زیادہ رہا ہے۔

عذرا: اور ہندوستان کسی ملک سے اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہا ہے۔

رفو: یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں۔

عذرا: شفو تم کچھ بولتے نہیں، کچھ تمہاری رائے بھی تو معلوم ہو۔

شفو: میں آپ لوگوں کی باتیں غور سے سن رہا ہوں، سننا بھی ایک بڑا کام ہے۔

عذرا: پھر بھی۔

شفو: تو سنئے کہ آپ دونوں اپنے ملک کے بارے میں بے حد جذباتی ہیں۔

رفو: وہ کیسے؟

عذرا: ہاں بتاؤ تو بھلا کیسے؟

شفو: دنیا کے ہر ملک کی اپنی تہذیب ہے، ہر ملک کے لوگ اپنے وطن اور اس کی معاشرت کو افضل سمجھتے ہیں، وطنیت جذباتی کمزوری ہے۔

رفو: تو کیا تاریخ کے اوراق غلط بتاتے ہیں کہ تہذیب کے فروغ میں قدیم ہندوستان کا بڑا حصہ ہے۔

شفو: روم کا بھی ہے اور مصر کا بھی ہے اور.....

عذرا: تو رفو نے یہ کہاں کہا کہ روم، مصر یا کسی اور ملک کا نہیں ہے۔

شفو: تو پھر ہندوستانی تہذیب کے بارے میں غوغا کیوں مچایا جائے۔

عذرا: اس لئے کہ اس سے اپنے ملک کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

رفو: اور اگر یہ محبت ہی نہیں رہے تو پھر وہ اپنے وطن کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔

عذرا: تاریخ اور فلسفے میں یہی فرق ہے، تاریخ ملک کے حقیقی حالات سے باخبر کرتی ہے، فلسفہ فکر کی گہرائیوں میں غلطاں رہنے کا نام ہے۔

شفو: گویا بھائی صاحب تاریخ میں آنرز کر رہے ہیں تو ملک کے سچے حالات سے باخبر ہو رہے ہیں اور میں فلسفہ پڑھ رہا ہوں تو فکر کی دلدل میں پھنستا جا رہا ہوں۔

رفو: شفو تم نے اپنے بارے میں کچھ غلط رائے نہیں قائم کی ہے، فلسفے میں آنرز کرنے والا وطن اور وطنیت سے کیا علاقہ رکھے اسے تو کائنات کی پیچیدگیوں میں ہی الجھا رہنا ہے۔

شفو: آپ مجھ سے دو سال بڑے ہیں، اس کا فائدہ اٹھا لیجئے، میں سگ باش والی بات جانتا ہوں، لیکن بھائی صاحب میں نے ایسے تاریخ داں دیکھے ہیں جنہیں ملک دشمن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

رفو: ایسے لوگ فلسفی بھی ہو سکتے ہیں۔

عذرا: تم لوگ تو خواہ مخواہ کی بحث میں الجھ گئے۔ بات بس اتنی ہے کہ تاریخی شعور ہو تو ایک باخبر شہری اپنے ملک کے وقار کو سمجھ سکتا ہے، اور فلسفہ حیات و کائنات کے مشکل مسائل کی طرف متوجہ کرتا ہے جس سے فکر میں جلا آتی ہے۔ دونوں کی اپنی اہمیت ہے۔

رفّو: ممی نے چلئے ایک قول فیصل دے دیا۔

شفّو: وہ دے بھی سکتی ہیں یہی تو ادب کا کمال ہے، کوئی دیکھے تو کبھی اندازہ نہ ہو کہ ممی بی. اے. پاس ہیں۔

رفّو: لیکن جب بولتی ہیں تو ادب کی پروفیسر معلوم ہوتی ہیں۔

عذرا: چلو ہٹو، تم دونوں نے مل کے اب مجھے بنانا شروع کیا ہے، دیکھو تمہارے پاپا بھی آ گئے۔

ریحان: ماں بیٹوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟

عذرا: کھچڑی کیا پکے گی دونوں اپنے اپنے مضمون کی عظمت گنوا رہے تھے۔

ریحان: یعنی

عذرا: رفّو کا خیال ہے کہ تاریخ دانی ملکی شعور بیدار کرتی ہے اور وطن دوست بناتی ہے، شفّو یہ نہیں مانتا۔

ریحان: شفّو شاید زیادہ غلط نہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے ماسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ مجید کا خاص مضمون تاریخ تھا، ویسے اس نے فلسفہ بھی لے رکھا تھا۔

عذرا: آپ بار بار مجید کا کیا ذکر کرتے ہیں اور تفصیل بتاتے ہی نہیں۔

رفّو: ہاں پاپا میں نے بھی مجید کا ذکر آپ سے سنا ہے، یہ کون حضرت ہیں یا تھے؟

شفّو: ممی ٹھیک کہتی ہیں، آپ کو تفصیل بتانی چاہئے۔

ریحان: کوئی خاص بات نہیں ہے بیٹے، مجید بہت غریب بلکہ مفلس باپ کا بیٹا تھا، کراچی پھر لندن جا کے بہت امیر کبیر ہو گیا۔

رفّو: مجید یقینی عقلمند آدمی ہوگا، مجھے ہندوستان سے بڑی محبت ہے، لیکن پیسوں کے لئے ملک سے باہر نکلنا ہی فائدہ مند ہے۔

شفّو: ورنہ افلاس ہمارا بھی پیچھا کرے گا۔

عذرا: میں ان باتوں کو بالکل فضول سمجھتی ہوں۔ اپنے ملک کی آدھی روٹی باہر کے ملغوبے سے بہتر ہے۔

ریحان: میں بھی کچھ اسی طرح سوچتا ہوں۔

رفو: لیکن پاپا ذرا ہم لوگ اپنے حالات پر ایک نگاہ ڈالیں، جس مکان میں ہم لوگ رہ رہے ہیں، داداجان نے بنایا تھا۔

شفو: اور اب یہ ہم لوگوں کے لئے ناکافی ہے۔

ریحان: تو نیا مکان بنالیں گے۔

رفو: لیکن روپئے کہاں سے آئیں گے؟

شفو: روپئے کمانے کے لئے فارن کا سفر ضروری ہے۔

ریحان: میں نے اپنی چھوٹی سی نوکری سے کیا کچھ نہ کیا، اللہ کا احسان ہے کہ تم لوگ دو چار مہینے میں گریجویٹ ہو جاؤ گے، پھر ملازمت ہو جائے گی، پھر مکان.....

عذرا: مکان نہ بھی بنے تو کیا نقصان ہے، سامنے کی بات تو ان دونوں کی شادی ہے۔

رفو: نہیں ممی ہم لوگ تو داداجان کے اس بوسیدہ مکان کو ایک بڑی عمارت میں تبدیل کرائیں گے۔

شفو: تب ہی ہم لوگ کچھ اور کریں گے۔

عذرا: تو اس کے لئے فارن کا سفر کیا ضروری ہے؟

ریحان: بالکل ضروری نہیں ہے۔

رفو: اپنے ملک میں پڑھے لکھوں کا جو حال ہے وہ سب پر ظاہر ہے، گریجویٹ کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے۔

شفو: پھر پاپا دو مہینے میں آپ بھی تو ریٹائر ہو رہے ہیں۔

عذرا: بیٹے، تمہارے پاپا نے بہت چاہا کہ اسکول کی تعلیم تم لوگوں کو کسی ہاسٹل میں رکھ کے دی جائے، لیکن میرا دل نہ مانا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو اپنی نگاہوں سے الگ نہیں کر سکتی۔

رفو: ممی آپ اتنی پڑھی لکھی ہیں اور اس طرح جذباتی ہو رہی ہیں۔

شفو: کیا آپ نہیں چاہیں گی کہ ہم لوگوں کی تنگی دور ہو، آپ کی خدمت کے لئے ایک ملازمہ چاہئے، پاپا کے لئے بھی ایک نوکر ضروری ہے۔ آپ دونوں عمر کی اس منزل میں ہیں کہ دیکھ بھال کے لئے لوگ باگ چاہئیں۔

رفو: پھر اپنے مکان اور اس کے ساز و سامان پر ایک نظر ڈالئے، یہ ٹوٹی ہوئی کرسیاں، یہ

ہلتی ڈولتی میزیں، پلاسٹر اجڑے ہوئے در و دیوار، ٹوٹے پھوٹے برتن۔

عذرا: بس بیٹا بس!

ریحان: ٹھیک ہے بیٹے ٹھیک، ٹھیک، اب جو بھی کرو جیسے بھی کرو، مجھے کیا حق ہے کہ ایسے حالات میں بہولاؤں، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔

عذرا: (سسکیاں لیتی ہے)

منظر

ریحان: میں کہتا ہوں عذرا تم ذرا اپنی حالت پر غور کرو، پندرہ دن ہوئے ہیں لڑکوں کو رخصت ہوئے اور تم آدھی ہو کر رہ گئیں، آخر تم نے سوچا کیا ہے؟

عذرا: میں اپنے دل کو کیا کروں، ہزار سوچتی ہوں بچے تو وہ تھے نہیں، چوبیس پچیس سال کے نوجوان ہیں، ذمہ دار ہیں، لیکن دل ہے کہ ڈوبا جاتا ہے، ان کا چہرہ آنکھوں میں گھومتا رہتا ہے، لگتا ہے ابھی ابھی وہ کہیں پر سے آواز دیں گے۔

ریحان: تم پڑھی لکھی عورت ہو، زمانہ بدل گیا ہے، تیز رفتار ہو گیا ہے، رفو، شفو اپنی زندگی سنوارنے باہر گئے ہیں، بس اتنی سی بات ہے، تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے لڑکے اپنی ہی محنت اور لگن سے اس لائق ہوئے کہ فارن کا سفر کر سکیں، نوکری حاصل کر سکیں۔

عذرا: میں بھی یہی سب سوچ کر دل کو بہلاتی ہوں، لیکن ان کے جاتے ہی جیسے بھوک مر گئی ہے، کچھ اچھا نہیں لگتا، کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ محسوس ہوتا ہے کہ سب کے سب کام یکبارگی ختم ہو گئے، ہائے یہ سناٹا۔

ریحان: میرے خیال میں تمہاری یہ حالت عارضی ہے، رفو، شفو اس طرح تمہارے آگے پیچھے رہے ہیں کہ فطری طور پر تم پر ان کے جانے کے اثرات ہیں، اپنے کو مصروف رکھو کسی کام میں بھی، مثلاً ناول پڑھو، کوئی رسالہ ہی اٹھا کر دیکھو، یقینی طبیعت بہل جائے گی۔

عذرا: ایک بات بتائیے زیادہ سے زیادہ کتنا وقت لگے گا، ان کے خط آنے میں؟

ریحان: ہفتہ دس دن اور لگ جائیں گے، ڈاک کا معاملہ ہے کچھ دیر بھی ہو سکتی ہے۔

عذرا: میرے لئے گھنٹے دو گھنٹے بھی پہاڑ معلوم ہوتے ہیں، جیسے وقت کی رفتار مدھم ہو گئی ہو۔

ریحان: میں پھر وہی کہوں گا کہ تم اپنے دل کو مضبوط کرو، ورنہ چارہ بھی کیا ہے؟

عذرا: ہاں چارہ بھی کیا ہے (طویل ٹھنڈی سانس بھرتی ہے)

ریحان: وقت بڑا مرہم ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا، دنیا اسی طرح چلتی ہے، کون کسی کے ساتھ کب تک رہا ہے، ہاں ایک بات یاد آئی ہم لوگ شمیم صاحب کو کیا جواب دیں گے، انہیں اطلاع بھی نہیں دی گئی اور لڑکے امریکہ چلے گئے۔ نزہت اور نکہت کو کب تک بٹھائے رکھیں گے وہ۔ ہر باپ چاہتا ہے کہ بیٹیوں کے ہاتھ جلد پیلے ہوں۔ جوان لڑکیوں کی دیکھ ریکھ اور مشکل بات ہے۔

عذرا: سال دو سال تو انتظار کرنا ہی پڑے گا انہیں، مانا کہ منگنی بھی نہیں ہوئی ہے، لیکن ہم لوگ زبان دے چکے ہیں پھر رفو، شفو کو نزہت اور نکہت پسند بھی ہیں۔

ریحان: یہ کہو کہ پسند تھیں۔

عذرا: کیوں؟ کیا وہ امریکہ پہنچ کے انہیں بھول جائیں گے؟ ہرگز ہرگز نہیں!

ریحان: تو شمیم صاحب کو حالات سے باخبر کر دیا جائے، کہا جائے کہ وہ ایک سال اور انتظار کریں۔

عذرا: بالکل یہی لکھا جائے انہیں۔

ریحان: اور اگر وہ انتظار نہ کر سکے تو۔

عذرا: کیوں نہ کریں گے، کیا دنیا بھر کے لڑکے ان کے دروازے پر قطار لگائے کھڑے ہیں کہ انتظار کرنا ان کے لئے محال ہوگا۔

ریحان: نزہت اور نکہت کیسی لڑکیاں ہیں؟

عذرا: اچھی بھلی ہیں، خوبصورت ہیں، پڑھی لکھی ہیں، سنجیدہ نظر آتی ہیں، گھر کا کام کاج خوب کرتی ہیں، بالکل ایسی ہیں جیسی ہمیں چاہئیں۔

ریحان: گویا نزہت اور نکہت ہماری جوان عذرا ہیں۔

عذرا: اب چھوڑیئے بھی اس چونچلے کو، پچاس برس کے بوڑھے ہو گئے اور کیا کیا یاد کرتے ہیں۔

ریحان: ہاں بھئی ٹھیک ہی کہتی ہو، حافظ کہہ گیا ہے:

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولیٰ

ماسٹر: (کھانسی کی آواز کے ساتھ) ریحان صاحب تشریف رکھتے ہیں؟

عذرا: دیکھئے ماسٹر صاحب آ گئے، بہت بیمار ہو گئے تھے شاید۔

ریحان: آیئے، آیئے تشریف لایئے، کہیئے کیسے مزاج ہیں؟ اب کے آپ اپنی بیماری سے خوب لڑے۔

ماسٹر: (نحیف ٹوٹی ہوئی آواز) ریحان صاحب، ٹھیک ہے کہ میں نے اب کے اسے پچھاڑ دیا ہے لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی، مرنا برحق ہے، میں ۶۵ کے لپیٹ میں ہوں، چھوڑیئے اب اس کو۔ صاحبزادوں کے خط وط آئے کیا؟

ریحان: پندرہ دن تو ہوئے ہیں کہ وہ گئے، بیگم کو بھی ان کے خط کا بڑا انتظار ہے۔

ماسٹر: لڑکوں کو کس طرح کی ملازمت امریکہ میں ملی ہے؟

ریحان: آپ جانتے ہی ہیں کہ گریجویشن کے بعد دونوں ہی نے بزنس مینجمنٹ کے امتحانات پاس کئے تھے، رفّو میکسیکو سیٹی میں ایک بڑی امریکی فرم میں کچھ ہو گیا ہے اور شفّو کو Ontario میں کوئی جگہ ملی ہے۔ بچے بتا رہے تھے کہ ایک دوسرے سے بہت دور رہیں گے، کافی دوری ہے دونوں جگہوں میں۔

ماسٹر: ان کی ممی کا کیا حال ہے؟

ریحان: مت پوچھئے، وہ تو بالکل ٹوٹ سی گئی ہیں، کبھی رفّو کا کوئی قصہ دہرا رہی ہیں تو کبھی شفّو کے کسی شوق کا ذکر کر رہی ہیں۔ رات دو بجے میری نیند ٹوٹی تو دیکھا کہ وہ ٹہل رہی ہیں، میں نے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا، بس چپکے چپکے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر بکس سے انہوں نے البم نکالے، ان میں رفّو، شفّو کے بچپن کی تصویریں ہیں، ایک ایک کر کے دیکھتی رہیں، تصویروں سے کچھ باتیں بھی ہوتی رہیں، وہ سمجھیں کہ میں سو رہا ہوں۔

ماسٹر: یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے، ریحان صاحب باہر جانے والوں کی اپنی مصروفیتیں ہوتی ہیں، پھر نئے حالات کے سانچے میں وہ ڈھلنے لگتے ہیں، کبھی کبھی تو وہ اپنے وطن کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں، رفّو، شفّو ایسے نہیں ہو سکتے پھر بھی..... تو ان کی ممی کو حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہئے، آپ سمجھایئے انہیں۔

ریحان: انہیں تو وقت ہی سمجھائے گا، آپ کو یاد ہوگا کہ اسکول سے واپسی میں پانچ دس منٹ کی دیر بھی ان پر کیا شاق گزرتی تھی، وہ ان کا بار بار دروازے کی طرف لپکنا، ہر لمحہ ان کے قدم کی چاپ پر کان دھرے رہنا۔

ماسٹر: وہ سب تو خیر ماضی کی باتیں ہیں، اب رفّو، شفّو کب واپس آئیں، کب اپنی ممی سے

ملیں کون جانے؟

ریحان: ویسے تو وہ ایک سال کے لئے گئے ہیں، ہوسکتا ہے دو چار مہینے زیادہ رہ جائیں۔

ماسٹر: اے کاش کے ایسا ہی ہو۔

ریحان: اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔

نیا منظر

عذرا: نہیں چاہئے مجھے یہ روپے۔ ہم روپے لے کر کیا کریں گے، تین برس انہیں گئے ہوئے گذر رے، اور اتنے عرصے میں ان کے نو خط آئے، اور ان خطوں میں ۲۷ سطریں ہیں۔ بس یہی کہ سب خیریت ہے۔ رقم جاتی ہے، مکان بنا لیجئے، فلاں چیز خرید لیجئے۔ نہیں نہیں مجھے روپے سے کوئی مطلب نہیں، مجھے رفو چاہئے، مجھے شفو چاہئے۔ رفو، اے بابو رفو، میرے شفو، میرے شفو (روتی ہے)۔

ریحان: رفو، شفو کی ممی ذرا اپنے آپ کو سنبھالو، آخر یہ کیا پاگلوں کی سی حرکت ہے، بچے مصروف ہیں، اپنی زندگیاں بنا رہے ہیں۔ ذرا سوچو تو ان ہی کی بھیجی ہوئی رقموں سے یہ عالیشان مکان بنا ہے، ٹیلی فون لگے ہیں، فرنیچر سجے ہیں، ظروف خریدے گئے ہیں، زیورات بنائے گئے ہیں، وہ آجائیں گے، پھر ان کی شادی ہوگی، ہاں خوب دھوم دھام سے ہوگی۔

عذرا: جھوٹ ہے کہ وہ آجائیں گے، آپ مجھے بہلاتے ہیں، محض بہلاتے ہیں، یہ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے کمرے، یہ خالی خالی کرسیاں، یہ سونا سونا باورچی خانہ..... رفو، شفو کے پاپا! خدارا انہیں لکھ دیجئے کہ وہ واپس آجائیں، جلد آجائیں، کیا وہ میری لاش کو کاندھا بھی نہیں دیں گے۔ میری قبر پر فاتحہ بھی نہیں پڑھیں گے (زور سے سسکیاں بھرتی ہے)۔

ریحان: (رندھی ہوئی آواز میں) بیگم! آخر یہ منحوس الفاظ کیوں رٹتی رہتی ہو، ذرا اپنا سراپا دیکھو، وہ جسم تمہارا کہاں گیا، گل کر روئی کی گالہ ہوگئی ہو، آنکھیں دھنس چکی ہیں، بال ایک ایک کر کے سفید ہوگئے، ٹھیک سے اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتی۔ کھانے کی ذرا پرواہ نہیں، رفو، شفو تو چلے گئے، کیا تم بھی مجھے.....

عذرا: رفو، شفو تو چلے گئے، بہت دور چلے گئے، ممی سے دور ہوگئے، پاپا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھ پر بھی یہ شب و روز بھاری ہیں، ان کے ساتھ میری نیندیں بھی رخصت ہوگئیں، اب مجھے رخصت ہونا باقی ہے، وہ لکھتے ہیں "سب خیریت ہے"، ہاں ہاں یہاں بھی سب خیریت ہے،

میرے بیٹے سب خیریت ہے، میرے لاڈلے سب خیریت ہے، نزہت، نکہت بیاہ دی گئیں، وہ اپنے نئے گھروں میں رخصت ہو گئیں، اب مجھے رخصت ہونا ہے، ہمیشہ کے لئے، بابو میرے، میرے اچھے بابو، میرے پیارے، میرے لاڈلے رخصت نہیں کرو گے مجھے۔

ریحان: مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی، خدا کی قسم دیکھی نہیں جاتی، میں باہر جاتا ہوں، جاتا ہوں باہر۔

نیا منظر

ماسٹر: آخر رفّو، شفّو کو آپ تفصیلی خط کیوں نہیں لکھتے، لکھئے کہ ان کی ماں کی کیا حالت ہے، بتائیے انہیں کہ ان کی ممی.....۔

ریحان: ماسٹر صاحب! کس کو کہاں خط لکھوں، کبھی وہ فونکس میں ہیں تو کبھی یوکون میں، کبھی لیک سیٹی کی خبر ہے تو کبھی وِکٹوریا آئی لینڈ کی، کوئی مستقل پتہ تو ہے نہیں، ایک آدھ سطر کا خط بھی آیا تو بس یہی کہ خیریت ہے، مصروفیت ہے، رقم جاتی ہے۔ دونوں بھائیوں میں بھی رابطہ کم ہی رہتا ہے۔

ماسٹر: دس برس کے قریب ہوئے ہوں گے اُن کو امریکہ گئے۔

ریحان: ہاں کچھ زیادہ ہی ہوئے، اور تو اور میں نے ان کی ممی کو بتایا نہیں شفّو نے لکھا تھا کہ بھیّا نے شادی کر لی، پھر رفّو کے خط سے معلوم ہوا کہ شفّو نے بھی بیاہ کر لیا، دونوں امریکی شہری بھی ہو چکے ہیں اور ان کی ماں ہیں کہ ان کے انتظار میں ہیں، روتے روتے اُن کی آنکھیں بہہ گئی ہیں، کھاٹ سے لگ گئی ہیں وہ، کھانسی تو اُنہیں ہر وقت رہتی ہے۔ منہ سے خون بھی آنے لگا ہے۔ ڈاکٹر لاتا ہوں تو دکھانے سے انکار کرتی ہیں، زور دیتا ہوں تو ہسٹریا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، میں تو صرف ہاتھ ملتا رہتا ہوں ماسٹر صاحب، میں کیا کروں، کیا کروں میں آخر۔

آخری منظر

ریحان: رفّو، شفّو کی ممی، آخر تم بھی مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو، بولو بیگم، بولو عذرا!

عذرا: یہاں بیٹھو رفّو، یہاں آؤ شفّو.....شفّو تم تو ایکدم بدل گئے ہو، نزہت بیٹی شفّو کو اولٹین کا بہت شوق ہے۔ پلاؤ نا اسے اولٹین، رفّو کی دلہن، بچپن ہی سے یہ شریر ہے، میری اچھی بہو نکہت، بیٹی نکہت انڈے کے حلوے، تم دونوں کھڑے کیوں ہو، رفّو، شفّو میرے ساتھ بیٹھو۔ تمہارا نیا مکان۔ سب سامان تیار ہے بیٹے، دیکھ لو، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، بیٹے کتنے دنوں کے بعد آئے

تم دونوں، ممی کو بھول گئے تھے کیا، نہیں تم بھول نہیں سکتے رف، رف، شف، شف۔

ریحان: ڈاکٹر صاحب، انہیں بچالیجئے، خدا کے لئے بچالیجئے، میں تنہا نہیں رہ سکتا، مجھے پہلے مرنا چاہئے، میں انہیں مرنے نہیں دوں گا۔

عذرا: ایں میں کہاں ہوں، یہ کون لوگ ہیں، امریکہ میں شفو بھی ہے اور رف، رف، رفو بھی اور میں بھی اور ان کے پاپا۔

ریحان: میں ہوں عذرا، میں ہوں، رفو، شفو کے پاپا، بیگم، بیگم، عذرا، عذرا، بولو بولو، ہاں کچھ بولو۔

عذرا: تو وہ..... وہ نہ نہیں، آ..... آ..... آئے۔ میں، میں جا..... جا..... جاتی..... تی ہوں، رف، رف، شف، شف کے پا..... پا، مے..... مے..... ری..... مو..... ت..... کی..... خ..... خ..... بر..... اُن..... اُنہیں..... نہ..... نہ..... ہیں..... دینا۔ لکھ..... لکھ..... لکھئے..... کہ..... کہ..... سب..... سب..... خے..... خے..... ری..... ری..... یت..... یت..... ہے۔ (دم توڑ دیتی ہے)

ریحان: سسکنے اور رونے کی آواز۔

(مطبوعہ: سہ ماہی ''مباحثہ'' جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء)

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی مرتبہ کتابیں

(۱) منظر نامہ (منظر کاظمی کی شخصیت اور فن کا محاسبہ)

(۲) غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار

(۳) رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ

(۴) زکی انور: جائزے اور افسانے

(۵) اُردو صحافت: مسائل اور امکانات

(۶) وہاب اشرفی: منفرد نقاد اور دانشور

(۷) عبدالصمد: عکس در عکس

(۸) نکتہ نکتہ تعارف (وہاب اشرفی کے تبصرے اور تقاریظ مع مقدمہ)

(۹) شناخت اور ادراکِ معنی (وہاب اشرفی کے تبصرے اور تقاریظ مع مقدمہ)

(۱۰) درپسِ آئینہ (مشاہیر کے خطوط وہاب اشرفی کے نام مع تفصیلی مقدمہ)

(۱۱) کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا (وہاب اشرفی کے افسانے مع مقدمہ)

(۱۲) سعادت حسن منٹو—**ایک لیجنڈ**

(۱۳) سعادت حسن منٹو کے افسانے (جلد اوّل) مع مقدمہ

(۱۴) سعادت حسن منٹو کے افسانے (جلد دوم) مع مقدمہ

(۱۵) سعادت حسن منٹو کے افسانے (جلد سوم) مع مقدمہ

(۱۶) سعادت حسن منٹو کے خاکے مع مقدمہ

(۱۷) سعادت حسن منٹو کے ڈرامے مع مقدمہ

(۱۸) سعادت حسن منٹو کے مضامین مع مقدمہ

(۱۹) سعادت حسن منٹو کا ناول ''بغیر عنوان کے'' مع مقدمہ

(۲۰) جمیل مظہری کا ناولٹ ''شکست و فتح'' مع مقدمہ

(۲۱) گلشن ادب

Kafir Bhi Huye, Sajdah Bhi Kiya

(Short Stories)

by

Wahab Ashrafi

Edited by

Dr. Humayun Ashraf

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-903-6